معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپے　　فی شمارہ پانچ روپے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپے

دیگر ممالک میں سالانہ　ہوائی ڈاک　پندرہ پونڈ　یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک　　پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ :۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARUL MUSANNBFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا —— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۰ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۴۱۳ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۹۲ء عدد ۵

مضامین

مقالات

آثارِ علمیہ

وفیات

ادبیات

شذرات

بمبئی کا علامہ شبلی سمینار

علامہ شبلیؒ کو بمبئی سے بڑی انسیت تھی۔ سیرت نبویؐ کی تالیف کا آغاز یہیں ہوا۔ فرماتے ہیں

نثارِ بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نو را	طراز مسند جمشید و فر تاج خسرو را
بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت"	کنارِ آب چوپاٹی و گلگشت اپالو را

بمبئی کے لوگ بھی علامہ کی قدردانی میں پیچھے نہیں ہیں۔ ۲۴ر ۲۵ر اکتوبر کو بمبئی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو نے مسلم ایجوکیشن سوسائٹی اعظم گڈھ کے تعاون سے "علامہ شبلی نعمانی۔ عالم اور ادیب" کے موضوع پر ایک قومی سمینار کیا۔ جو صابو صدیق انجینئرنگ کالج کے المالطیفی ہال میں ہوا۔ دارالمصنفین سے خاکسار اور مولوی محمد عارف عمری اس میں شریک ہوئے۔ ممتاز دانشور اور مہاراشٹر کے مشہور سیاسی رہنما ڈاکٹر رفیق زکریا چانسلر جامعہ اردو علی گڑھ نے افتتاحی جلسہ کی صدارت کی۔ ان کی عالمانہ صدارتی تقریر ان کی بالغ نظری اور علامہ شبلی کی عظمت شناسی کی آئینہ دار تھی۔ سمینار کے داعی ڈاکٹر عبدالستار دلوی نے گرم جوشی سے مہمانوں، مندوبین اور شرکائے اجلاس کا خیر مقدم کیا۔ جلسہ کا افتتاح بمبئی یونیورسٹی کے وائس چانسلر کرنے والے تھے۔ وہ نہیں آئے تو مسلم ایجوکیشن سوسائٹی اعظم گڈھ کے صدر ابو صالح انصاری صاحب نے کیا۔

افتتاحی جلسہ میں جناب سید حامد سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ جس کے پڑھنے کے دلکش انداز نے حاضرین کو مسحور کر دیا۔ جلسہ کا خاتمہ ڈاکٹر یونس اگاسکر استاد شعبۂ اردو بمبئی یونیورسٹی کے شکریہ پر ہوا۔ مقالات کے تین جلسے ہوئے۔ پہلے جلسہ کی صدارت مجھ نااہل کو بخشی گئی۔ اس میں حسب ذیل مقالات پڑھے گئے: علامہ شبلیؒ اور سیرۃ النبیؐ (مولوی محمد عارف عمری رفیق دارالمصنفین)۔ علامہ شبلیؒ اور سرسید (ڈاکٹر خلیق انجم دہلی)۔ علامہ شبلیؒ اور علی گڑھ تحریک (ڈاکٹر اصغر عباس علی گڑھ)۔ علامہ شبلیؒ نقوش اور تاثرات (ڈاکٹر

قادر حسین پرنسپل صابو صدیق انجینیرنگ کالج بمبئی)۔ علامہ شبلیؒ بحیثیت تنقید نگار (حکیم الطاف احمد اعظمی جامعہ ہمدرد دہلی)۔ ڈاکٹر خلیق انجم کے مقالہ پر زیادہ بحث ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ علامہ اور سرسید میں اختلاف تو تھا لیکن مخالفت نہیں تھی۔ دوسرے مقالات پر بھی گفتگو رہی۔

دوسرے اور تیسرے جلسے کی صدارت ڈاکٹر انور معظم اور ڈاکٹر خلیق انجم نے کی اور یہ مضامین پڑھے گئے: علامہ شبلیؒ کی شعر فہمی (ضیاء الدین اصلاحی، اعظم گڈھ)۔ علامہ شبلیؒ اور ندوہ تحریک (مولانا مستقیم احسن اعظمی بمبئی)۔ علامہ شبلیؒ اور تعلیم نسواں (ڈاکٹر صادقہ ذکی جامعہ ملیہ دہلی)۔ علامہ شبلیؒ اور اسلامی افکار (ڈاکٹر انور معظم حیدرآباد)۔ علامہ شبلی اور فلسفۂ جدید (محمد یونس ادیب بمبئی)۔ علامہ شبلیؒ کی فارسی شاعری (پروفیسر احمد انصاری بمبئی یونیورسٹی)۔ علامہ شبلیؒ اور دارالمصنفین (ڈاکٹر خورشید نعمانی مہاراشٹر دیانند کالج بمبئی)۔ انور معظم صاحب کے مقالہ پر راقم نے عرض کیا کہ علامہ شبلیؒ کے افکار کو سمجھنے کیلئے صرف الکلام اور علم الکلام کافی نہیں ہے۔ مولوی عارف عمری نے کہا کہ علامہ کی مذہبی فکر کو جاننے کے لیے ادوار کا لحاظ ضروری ہے۔ آخر میں وہ علامہ ابن تیمیہؒ کے فکر و خیال کے حامی ہو گئے تھے۔ انور صاحب نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا۔ سمینار کو کامیاب بنانے میں ڈاکٹر عبدالستار دلوی اور ان کے رفقائے کار ڈاکٹر یونس اگاسکر، پروفیسر معین الدین جینا بڑے اور ڈاکٹر خورشید نعمانی پیش پیش رہے۔ مولانا مستقیم احسن اعظمی کی دلچسپی نے سمینار میں جان ڈال دی تھی۔ انہی نے ہم لوگوں سے اس میں شرکت کا وعدہ کئی ماہ پہلے لے لیا تھا۔ جناب ابو صالح انصاری، رضوان احمد فاروقی اور ابو عاصم اعظمی کے تعاون نے بھی سمینار کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔

میرا قیام کرلا میں اپنی بہن کے یہاں تھا۔ جہاں سے ہر جگہ لیجانے اور لانے کیلئے بھارت آٹو کمپنی کارپوریشن کے مالک شیخ سلطان احمد اور میرے بھانجے سہیل احمد اپنی گاڑی لیے موجود رہتے

رضوان فاروقی صاحب نے بڑا پُر تکلف عشائیہ دیا۔ مولانا مستقیم احسن اعظمی اور ڈاکٹر خورشید نعمانی کی رفاقت برابر میسر رہی۔ ان سب کا تہ دل سے شکر گذار ہوں۔ ایک روز ڈاکٹر دلوی کے یہاں ناشتہ پر جناب ضیاء الدین ڈیسائی سے ملاقات ہوئی جس کی خوشگوار یاد تازہ ہے۔ بمبئی کے مشہور ڈاکٹر عبدالکریم نائک دارالمصنفین کے بڑے ہوا خواہ ہیں۔ ان کی خواہش تھی کہ معارف کی توسیعِ اشاعت اور دارالمصنفین کی مطبوعات کی خریداری کی مہم چلائی جائے۔ ان کے خیال میں علامہ شبلیؒ کو بہترین خراجِ عقیدت یہی ہے کہ ان کی تصنیفات کی نشر و اشاعت ہو۔ اور علامہ کی یادگار دارالمصنفین کو مستحکم کیا جائے۔ بمبئی روانہ ہونے سے پہلے ہی ان کا گرامی نامہ ملا تھا ہم لوگ مقررہ وقت پر ان کی کلینک پر نہیں پہونچے تو وہ کسی دوسرے پروگرام میں شرکت کیلئے روانہ ہوگئے۔ مگر اپنے معاونین کو ہمیں اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن دکھانے اور انگریزی ترجمہ قرآن مجید دیے جانے کی ہدایت فرما گئے تھے۔ انھوں نے فاؤنڈیشن کو اسلام کی دعوت و تبلیغ کا وسیلہ بنایا ہے اسی مقصد سے انگریزی، اردو اور دوسری زبانوں میں اسلامی لٹریچر کا ذخیرہ مہیا کیا ہے اور اردو انگریزی تقریروں کے ویڈیو کیسٹ بھی تیار کیے ہیں اس کی بدولت بعض لوگ اسلام کے حلقہ بگوش ہو رہے ہیں۔

مولانا مختار احمد ندوی امیر مرکزی جمعیۃ اہل حدیث نے حال ہی میں الدار السلفیۃ کو نیا روپ دیا ہے۔ عین روانگی کے دن گاڑی بھیج کر اسے دکھایا۔ اللہ ان کے اس کام کو فروغ دے منصورہ مالیگاؤں میں جامعہ محمدیہ، مدرسہ عائشہ، طبیہ کالج اور سائرا اسپتال بھی مولانا کے جوشِ عمل کا نتیجہ ہیں انھیں دیکھنے کا کئی بار اتفاق ہو چکا ہے۔ اس سفر میں بھی مولوی محمد عارف عمری کے ہمراہ وہاں گیا تو ہمیں لینے کے لیے منماڈ اسٹیشن پر جامعہ کے ناظم مولانا جمیل احمد عمری کی ہدایت پر جامعہ کے استاذ مولوی راحت اللہ فاروقی گاڑی لیکر موجود تھے۔ انھوں نے اچھی تواضع کی اور ہم لوگوں کو چھوڑنے کیلئے جامعہ کے طالب العلم اور میرے چھوٹے لڑکے محمد سلیم جاوید کو گاڑی سے منماڈ بھیجا۔ فجزاھم اللہ خیر الجزاء۔

اس دوران آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کا کنونشن اور انجمن طلبائے قدیم جامعۃ الفلاح کا تعلیمی اور فقہ اکیڈمی کا فقہی سمینار ہوا جن میں شرکت نہیں ہو سکی۔

[illegible] فرمائے

مقالات

حضرت مثنیٰ بن حارثہ شیبانیؓ

سوادِ عراق کے فاتحِ اول

از مولانا قاضی اطہر مبارکپوری

(۲)

حضرت ابوبکرؓ کے پاس حاضری اور سوادِ عراق میں جہاد کیلئے ترغیب

خلافتِ صدیقی کی ابتدا میں ایک طرف خالد بن ولید قتالِ مرتدین میں مصروف تھے، دوسری طرف مثنیٰ بن حارثہ سوادِ عراق میں اپنی سرگرمی دکھا رہے تھے اور دونوں محاذ کی خبریں حضرت ابوبکرؓ کو پہونچا کرتی تھیں، قتالِ مرتدین کے بارے میں حضرت ابوبکرؓ کو سب کچھ معلوم تھا مگر مثنیٰ بن حارثہ کی سرگرمیوں کے علم کے باوجود ان کی شخصیت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا، اس لیے انھوں نے ایک مرتبہ لوگوں سے دریافت کیا کہ یہ کون شخص ہے جس کا نسب معلوم ہونے سے پہلے اس کے وقائع اور معرکوں کی خبریں ہمارے پاس آرہی ہیں، اس وقت مشہور صحابی حضرت عاصم بن قیس منقری تمیمیؓ موجود تھے، انھوں نے بتایا کہ یہ شخص غیر معروف نہیں ہے نہ مجہول النسب ہے، نہ اس کے پاس آدمیوں کی کمی ہے اور نہ اس کا مکان معمولی قسم کا ہے، یہ مثنیٰ بن حارثہ شیبانی ہے[1]

[1] فتوح البلدان ص ۲۴۲۔

کچھ دنوں کے بعد خود مثنیٰ بن حارثہ حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں آئے اور سلطنت فارس کی ابتری اور انتشار کے بارے میں اپنے مشاہدات و تجربات بیان کیے اور اپنی معرکہ آرائیوں اور سرگرمیوں کا تذکرہ کرکے تجویز رکھی کہ آپ مجھ کو میری قوم بنو شیبان کا امیر بنا دیں، میں ان کو لے کر جہاد کروں گا، حضرت ابوبکرؓ نے ان کی خواہش اور پیش کش پر ان کو امارت کی تحریر دے دی، انھوں نے واپس جاکر باقی ماندہ لوگوں کو اسلام کی دعوت دی اور وہ سب مسلمان ہوگئے، اس کے بعد مثنیٰ بن حارثہ نے اپنے بھائی مسعود بن حارثہ شیبانی کو بھیج کر حضرت ابوبکر سے مدد طلب کی۔

دینوری کی روایت کے مطابق مثنیٰ بن حارثہ نے حضرت ابوبکرؓ کو خط لکھ کر معاملات طے کیے اور بلاذری نے لکھا ہے کہ وہ خود حاضر ہوئے تھے، اس وقت (صفر ۱۲ھ) حضرت خالد قتال مرتدین سے فارغ ہوچکے تھے، حضرت ابوبکرؓ نے ان کو لکھا کہ حیرہ جائیں اور مثنیٰ بن حارثہ کو لے کر اہل فارس سے جنگ کریں اور مثنیٰ کو لکھا کہ وہ خالد بن ولید سے مل کر ان کے احکام کی تعمیل کریں، بعض روایات میں ہے کہ خالد بن ولید مدینہ آگئے تھے اور یہیں سے حیرہ روانہ ہوئے[1]

اس کے بعد بعض دوسرے حضرات نے بھی حضرت ابوبکرؓ سے اسی قسم کی اجازت طلب کی، بلاذری نے لکھا ہے کہ مذعور بن عدی عجلی نے حضرت ابوبکرؓ کو اپنا اور اپنی قوم کا حال لکھ کر قتال فارس کی اجازت طلب کی، حضرت ابوبکرؓ نے ان کو لکھا کہ خالد بن ولید کے ساتھ رہ کر جہاں وہ قیام کریں تم بھی قیام کرو،

[1] الاخبار الطوال ص ۱۱۱ و فتوح البلدان ص ۲۴۲۔

اور جب کوچ کریں تو تم بھی کوچ کرو، اصابہ میں ہے کہ مثنیٰ اور مذعور دونوں نے حضرت ابوبکرؓ کے پاس آکر اہل فارس سے جہاد کی اجازت چاہی اور یہ کہ ان کی قوم پر ان کو امیر مقرر کیا جائے، حضرت ابوبکرؓ نے ان کو اس کی اجازت دی[1]

خلافت صدیقی میں فتوحات

مثنیٰ بن حارثہ حضرت ابوبکرؓ سے اجازت لے کر واپس چلے گئے، ان کے پیچھے خالد بن ولید نکلے اور مقام نباج میں دونوں حضرات مل گئے، وہاں سے آگے بڑھے اور ابلہ پہونچے تو معلوم ہوا کہ سوید بن قطبہ عجلی بکر بن وائل کی ایک جماعت کے ساتھ مثنیٰ بن حارثہ کی طرح یلغار کر رہے ہیں اور ایرانیوں نے ان سے مقابلہ کے لیے تیاری کی ہے، خالد بن ولید نے ایک تدبیر سے ابلہ کو فتح کیا، اس کے بعد خریبہ، نہرالمرہ، کسکر، زندورد، درتی اور ہرمزجرد وغیرہ میں فتح و صلح کرتے ہوئے الیس پہونچے، یہاں ایرانی سپہ سالار جابان آمادۂ جنگ ہوا، خالد بن ولید نے اس سے مقابلہ کے لیے مثنیٰ بن حارثہ کو روانہ کیا اور مقام نہرالدم میں اس شرط پر صلح ہوئی کہ مقامی باشندے مسلمانوں کے لیے مخبری اور ان کی مدد کریں گے، یہ صلح صفر یا رجب ۱۲ھ میں ہوئی، یہاں سے خالد بن ولید مجمع الانہار پہونچے، دیکھا کہ ایرانیوں نے مسلمانوں سے مقابلہ کی پوری تیاری کر رکھی تھی، سپہ سالار آزادبہ مقابلہ کے لیے سامنے آیا اور جنگ کے بعد رام کیا گیا[2]

یہیں سے خالد بن ولید نے مثنیٰ بن حارثہ شیبانی، مذعور بن عدی عجلی، حرملہ بن مریط حنظلی اور سلمی بن قین حنظلی کو خفان اور نمارق کی طرف روانہ کیا، اسوقت مذعور بن عدی کے ساتھ بکر بن وائل اور ضبیعہ وغیرہ کے چار ہزار آدمی تھے،

[1] فتوح البلدان ص ۲۴۳ و اصابہ ج ۶ ص ۴۷ [2] تاریخ خلیفہ بن خیاط و فتوح البلدان۔

ان امراء نے دونوں مقامات کو فتح کیا۔[1]

مذکورہ بالا مقامات میں عربوں سے مقابلہ کے لیے شاہان ایران کی طرف سے سامان جنگ، فوج، سپہ سالار اور مرزبان یعنی حاکم ہر وقت موجود رہتے تھے، ان مقامات کی فتح و صلح کے بعد خالد بن ولید مثنیٰ بن حارثہ کو لے کر ملوک آل منذر کے دارالسلطنت حیرہ پہونچے جہاں کسریٰ پرویز نے نعمان بن منذر کے بعد ایاس بن قبیصہ طائی کو حاکم بنایا تھا، خالد بن ولید سے گفتگو کے لیے ایاس بن قبیصہ طائی کے ساتھ عبدالمسیح (بقیلہ) ازدی اور ہانی بن قبیصہ بن مسعود شیبانی حیرہ کے قلعہ سے آئے اور مسلمانوں کو ایک لاکھ درہم سالانہ ادا کرنے پر صلح ہوئی، اسی کے ساتھ یہ شرط بھی لگائی گئی کہ اہل حیرہ مسلمانوں کے خلاف کوئی اقدام نہیں کریں گے اور ان کو حالات سے باخبر رکھیں گے، مذکورہ بالا فتوحات میں حیرہ کی فتح سب سے اہم تھی اور یہیں سے عراق کے مال غنیمت کی پہلی کھیپ مدینہ منورہ پہونچی، فکان الذی اخذ منھم اول مال حمل الی المدینۃ[2]

دینوری نے لکھا ہے کہ خالد بن ولید حیرہ میں مثنیٰ بن حارثہ اور عمرو بن حزم انصاری کو تعینات کرکے انبار اور عین التمر کی مہم پر روانہ ہوگئے اور یہ دونوں سواد عراق میں حضرت ابوبکرؓ کی وفات تک اپنی سرگرمی دکھاتے رہے[3] حالانکہ فتح حیرہ کے بعد بھی مثنیٰ بن حارثہؓ خالدؓ بن ولید کے ساتھ مہمات میں شریک رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حیرہ کے مرکز سے مثنیٰ بن حارثہ متعلق رہ کر

[1] اصابہ ج ۶ ص ۵، [2] فتوح البلدان ص ۲۴۴ و الاخبار الطوال ص ۱۱۲

[3] ایضاً۔

فتوحات میں بھی حصہ لیتے تھے، چنانچہ حیرہ کی مہم کے بعد معلوم ہوا کہ ایرانی سپہ سالار جابان نے مقام تستر میں زبردست فوجی تیاری کر رکھی ہے، اس خبر پر خالد بن ولید نے مثنیٰ بن حارثہ شیبانی اور حنظلہ بن ربیع اسیدی کو مقابلہ کے لیے روانہ کیا مگر ان کے پہونچنے سے پہلے ہی جابان نے راہ فرار اختیار کرلی تھی[1]

خالدؓ بن ولید انبار پہونچے تو مقامی لوگ قلعہ بند ہوگئے، ان سے صلح و شرائط کے بعد عین التمر کو فتح کیا، اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے خالدؓ بن ولید کو ابوعبیدہ بن جراحؓ کی مدد کے لیے ملک شام جانے کا حکم دیا، بلاذری کی تصریح کے مطابق ان کی روانگی ربیع الاول یا ربیع الثانی ۱۳ھ میں ہوئی تھی، خالد بن ولید نے جاتے ہوئے مثنیٰ بن حارثہ کو دعائیں دیں، ان کی خدمات کا اعتراف کرکے حیرہ لوٹ جانے کا حکم دیا، ان کے الفاظ یہ ہیں:

ارجع رحمک اللہ الی سلطانک فغیر مقصر ولا وان[2]

تم پر اللہ تعالیٰ رحم کرے، اپنی عملداری کی طرف لوٹ جاؤ، تم نے مفوضہ خدمات میں نہ کوئی کمی کی اور نہ سستی دکھائی۔

حسب روایت مثنیٰ بن حارثہ اپنے مرکز حیرہ چلے آئے، اس کے دو تین ماہ بعد آخر جمادی الاخری ۱۳ھ میں حضرت ابوبکرؓ کا وصال ہوگیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے، اس مدت میں مثنیٰ بن حارثہ اور عمرو بن حزم انصاری سواد عراق میں موقع بہ موقع ایرانیوں سے ٹکر لیتے رہے۔

حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضری اور مسلمانوں کی ہمت افزائی

طبری نے بیان کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے خلیفہ ہونے

[1] فتوح البلدان ص ۲۴۷، [2] ایضاً ص ۲۵۰۔

کے بعد سب سے پہلے یہ کام کیا کہ مثنیٰ بن حارثہ کے ساتھ اہل فارس سے جہاد کے لیے مسلمانوں کو دعوت دی مگر شاہان فارس کی شان و شوکت اور ان کے قہر و جبروت کی وجہ سے مسلمان بہت زیادہ مرعوب تھے، اس لیے عراق کی طرف جانے کے لیے تذبذب میں تھے، اس وقت مثنیٰ بن حارثہ موجود تھے انھوں نے مجمع کے سامنے پُرجوش تقریر کی اور کہا کہ:

یا ایها الناس! لا یعظمن	اے لوگو! اس رخ کو اہمیت نہ دو،
علیکم هذا الوجه، فانا قد	ہم نے فارس کا صحرا چھان مارا ہے،
تبجبجنا ریف فارس،	اور سواد عراق کے بہترین علاقہ
وغلبناهم علی خیر شقی	پر قبضہ کر کے ان پر غالب آگئے
السواد، وشاطرناهم،	ہیں اور ان سے بٹوارا کر لیا ہے،
ونلنا منهم، واجترء من	ہمارے آدمی ان کے مقابلہ میں جری
قبلنا علیهم، ولنا ان شاء الله	ہو گئے ہیں، انشاء اللہ اس کے بعد کا
مابعدها[1]	علاقہ بھی ہمارے قبضہ میں آئے گا،

حضرت عمرؓ کی پُرجوش دعوت جہاد اور مثنیٰ بن حارثہ کی ہمت افزائی پر سب سے پہلے ابو عبید ثقفی نے بڑھ کر لبیک کہا، اس لیے حضرت عمرؓ نے ان ہی کو امیر لشکر بنا کر عراق روانہ کیا اور سلیط بن قیس انصاریؓ، مسلمہ بن اسلم کو یہ تاکید کر کے ان کے ساتھ کر دیا کہ میں تم سے زیادہ افضل شخص کو ساتھ بھیج رہا ہوں، تم ان کے مشورہ پر عمل کرنا اور مثنیٰ بن حارثہ کو لکھا کہ تم ابو عبید کا استقبال کرو

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۱۶۰۔

اور ان کے ساتھ سمع و طاعت کا معاملہ رکھو۔

جنگ قس الناطف میں شکست

ابو عبید کی آمد کی خبر سن کر مردان شاہ چار ہزار سواروں کے ساتھ مقابلہ کے لیے آیا، ابو عبید نے دریائے فرات کے پل کی مرمت کرا کے اسلامی لشکر کو اس پار لے جانا چاہا تو مثنیٰ بن حارثہ نے اس خطرناک اقدام سے روکا اور کہا:

ایها الامیر لا تقطع هذه	اے امیر! اس موج کو پار مت کرو
الحجة، فتجعل نفسك ومن	ورنہ اپنے کو اور اپنے ساتھیوں کو
معك عرضا لاهل فارس[1]	ایرانیوں کا نشانہ بنا دوگے۔

ابو عبید نے کہا کہ تم بزدل ہو گئے ہو، مسلمہ بن اسلم اور سلیط بن قیس نے بھی ابو عبید کو بہت سمجھایا اور بتایا کہ اس سے پہلے عربوں کو ایرانیوں سے جنگ کا سابقہ نہیں پڑا ہے، اگر جنگ کے حالات بدلے تو مسلمانوں کے لیے اس میدان میں کوئی پناہ گاہ نہیں ملے گی، مگر ابو عبید نے جوش جہاد میں کسی کا مشورہ قبول نہیں کیا اور سب کو بزدل بتایا، یہ رمضان کا مہینہ تھا، جب مثنیٰ بن حارثہ نے دیکھا کہ ابو عبید کسی کا مشورہ قبول نہیں کرتے تو اسلامی لشکر کے سامنے پُرجوش خطبہ دیا جس میں کہا کہ:

انکم صوام، والصوم مرقة	تم لوگ روزہ سے ہو اور روزہ
ومضعفة وانی اری من	کمزوری اور ضعف پیدا کرتا ہے،
الرای ان تفطروا ثم تقووا	میری رائے ہے کہ تم لوگ روزہ

[1] الاخبار الطوال ص ۱۱۳۔

بالطعام علی قتال عدوکم | توڑ دو اور دشمن سے جنگ کے لیے کھانا کھا کر طاقت پیدا کرو۔

اس رائے کے مطابق مسلمانوں نے فوراً روزے توڑ کر جنگ کی تیاری کی اور ابو عبید اسلامی لشکر کو دریائے فرات کے اس پار لے گئے، مقام قس الناطف پر جنگ ہوئی، سب سے پہلے ابو عبیدہ شہید ہوئے، ان کے بعد یکے بعد دیگرے کئی امرائے لشکر کی شہادت ہوئی، اس جنگ میں اسلامی لشکر کو سخت ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا اور بہت زیادہ جانی نقصان ہوا، کتنے مسلمان دریائے فرات پار کرتے ہوئے غرق ہوگئے، آخر میں مثنیٰ بن حارثہ آگے بڑھ کر ایرانیوں سے مقابلہ کرتے رہے اور عروہ بن زید طائی سے کہا کہ تم پل پر جاؤ اور ایرانی لشکر کو پار نہ ہونے دو، مثنیٰ بن حارثہ نے بڑی بہادری سے مسلمانوں کو بچایا، ان کے ساتھ اس وقت عاصم بن عمرو، کلیح ضبی اور مذعور مسلمانوں کی حفاظت میں پیش پیش تھے، مثنیٰ بن حارثہ نے اسلامی لشکر میں اعلان کیا کہ:

یا ایھا الناس انا دونکم	اے لوگو! ہم تمھاری پشت پر ہیں
فاعبروا علی ھنیتکم و لا	اطمینان سے دریا پار کرو، بالکل نہ
تدھشوا، فانا لن نزائل	گھبراؤ، جب تک ہم تم لوگوں کو اس
حتی نراکم من ذالک	پار نہیں دیکھ لیں گے، یہاں سے
الجانب، ولا تغرقوا	ٹلنے والے نہیں ہیں اس لیے اپنے
انفسکم[1]	اندر انتشار نہ پیدا کرو۔

[1] تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۱۷۶۔

اس معرکہ میں مثنیٰ بن حارثہ شدید زخمی ہوئے، ان کے زرہ کی کڑیاں جسم میں پیوست ہوگئی تھیں جو بظاہر ان کی موت کا سبب ثابت ہوئیں، یہ جنگ آخری رمضان ۱۳ھ میں ہوئی تھی، اس کو یوم قس الناطف اور یوم الجسر کہتے ہیں۔

اس عظیم حادثہ کے بعد مثنیٰ بن حارثہ بچے کھچے لشکر کو لے کر ثعلبیہ چلے آئے اور حضرت عمرؓ کو لکھ کر اس کی خبر دی جس کو سن کر ان کو بے حد رنج و غم ہوا اور قاصد عروہ بن زید سے کہا کہ تم واپس جا کر لوگوں سے کہو کہ اسی جگہ ٹھہرے رہیں، یہاں سے بہت جلد مدد جائے گی، اس درمیان میں مثنیٰ بن حارثہ عربوں کو جہاد کی دعوت دیتے رہے اور نسیر بن دیسم اور حذیفہ بن محصن کو سواروں کی ایک جماعت کے ساتھ جہاد کے لیے روانہ کیا، انھوں نے بنی تغلب سے جنگ کر کے فتح پائی، اس کے بعد تکریت والوں سے صلح کر کے عہد نامہ لکھ دیا[1]

جنگ نخیلہ میں شاندار فتح اور مہران کا قتل

ادھر حضرت عمرؓ نے عراق میں جہاد کے لیے اعلان عام کیا اور خود وہاں جانے کے لیے آمادہ ہوگئے، ان کی ترغیب و تشویق پر مختلف قبائل اپنے امراء و رؤساء کو لے کر مدینہ آگئے، اور حضرت عمرؓ نے جریر بن عبداللہ بجلی کی امارت میں اسلامی لشکر ثعلبیہ روانہ کیا، مثنیٰ بن حارثہ بھی ان کے ساتھ ہوگئے اور دیر ہند پہونچ کر اطراف و جوانب میں سرگرمی دکھاتے رہے، مسلمانوں کی آمد کی خبر پاکر یزدجرد نے مہران بن مہردیہ کو بارہ ہزار سواروں کے ساتھ مقابلہ کے لیے روانہ کیا، اب کے بار اسلامی لشکر دریائے دجلہ کے قریب مقام بویب میں رکا رہا، مہران نے اپنی

[1] فتوح البلدان ص ۲۵۰۔

فوجوں کو لے کر دریا پار کیا اور جانبین میں سخت معرکہ آرائی ہوئی، مثنیٰ بن حارثہ لشکر کے میمنہ میں تھے، سب سے پہلے انھوں نے نکل کر دشمن پر حملہ کیا، ایرانیوں نے بھی پوری طاقت سے حملہ کیا اور گھمسان کی جنگ ہوئی حتیٰ کہ مسلمانوں کے پیر اکھڑنے لگے، مثنیٰ بن حارثہ افسوس سے بار بار داڑھی پر ہاتھ پھیرتے اور بلند آواز سے کہتے رہے ایہا الناس الی الی انا المثنیٰ (اے لوگو! میرے پاس آؤ) میں مثنیٰ ہوں، یہ سنتے ہی اسلامی لشکر نے پلٹ کر فیصلہ کن حملہ کیا۔[1]

مثنیٰ بن حارثہ نے اسلامی لشکر کے ایک حصہ میں انتشار دیکھا تو ایک آدمی کو بھیج کر کہلوایا کہ امیر تم لوگوں کو سلام کے بعد کہتے ہیں کہ لا تفضحوا المسلمین الیوم یعنی آج مسلمانوں کو رسوا نہ کرو، یہ جملہ سنتے ہی لشکر منظم ہوگیا اور مثنیٰ بن حارثہ خوشی سے ہنسنے لگے اور اسلامی لشکر کی ہمت افزائی کرتے ہوئے کہا کہ:

ان الذی تسمعون فشل — ایرانی لشکر میں یہ شور و غوغا جو تم
فالزموا الصمت وأتمروا — سن رہے ہو خاموشی سے بدل جائیگا
همسا[2] — تم لوگ آہستہ آہستہ رائے مشورہ کرو۔

اس جنگ میں مثنیٰ بن حارثہ کے بھائی مسعود بن حارثہ شیبانی ان کے پہلو بہ پہلو لڑ رہے تھے، حتیٰ کہ ان کی شہادت ہوگئی تو مثنیٰ بن حارثہ نے بلند آواز سے کہا:

یا معشر المسلمین ھکذا — مسلمانو! تمھارے اشراف اسی طرح
مصرع خیارکم، ارفعوا — جان دیتے ہیں، تم اپنے جھنڈوں کو

۱ الاخبار الطوال ص ۱۱۴ ۲ تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۱۹۰ و ص ۲۱۹۲۔

رایاتکم[1] — بلند رکھو،

اور مسعود بن حارثہ نے زخم کھا کر گرنے کے بعد اپنے قبیلہ کو مخاطب کرکے کہا:

یا معشر بکر بن وائل ارفعوا — اے بکر بن وائل کے لوگو! اپنے
رایاتکم، رفعکم اللہ، لا — جھنڈے کو بلند رکھو، اللہ تم کو
یھولنکم مصرعی[2] — بلند کرے گا، میرے گر جانے سے نہ گھبراؤ۔

اس جنگ کے نتیجہ میں ایرانی سپہ سالار مہران مارا گیا، اس کا لشکر بھاگ کھڑا ہوا، مسلمانوں نے تعاقب کرکے ان کے بہت سے آدمیوں کو تہ تیغ کیا، اسکو مثنیٰ بن حارثہ نے قتل کیا اور وہ "قاتل مہران" کی حیثیت سے مشہور ہیں۔

یہ جنگ ۱۴ھ میں ہوئی، اس کو یوم نخیلہ اور یوم مہران کہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے یوم جسر کے غم کو یوم مہران کی خوشی سے بدل دیا اور مسلمانوں کے مجاہدانہ جذبات میں نئی تاب و تواں عطا فرمائی، اس فتح کا سہرا مثنیٰ بن حارثہ کے سر ہے، اس موقع پر عروہ بن زید نے کہا ہے:

ایام سار المثنیٰ بالجنود لھم — فقتل القوم من رجل و رکبانا
جن دنوں مثنیٰ ایرانیوں سے جنگ کے لیے لشکر لیکر چلے اور انکی فوج کے پیدل اور سواروں کو قتل کیا،
سما لاجناد مہران وشیعته — حتی ابادھم مثنیٰ و وحدانا
وہ مہران کی فوجوں اور اس کے مددگاروں پر چھاگئے — یہانتک کہ انکو دو دو، ایک ایک کرکے قتل کر دیا،
ما ان رأینا امیرا بالعراق مضی — مثل المثنیٰ الذی من آل شیبانا

۱ الاخبار الطوال ص ۱۱۴ ۲ تاریخ طبری ج ۳ ص ۲۱۹۴۔

ہم نے عراق میں اس سے پہلے ایسا امیر نہیں دیکھا جو آل شیبان کے مثنیٰ جیسا ہو،

ان المثنیٰ الامیر القرم لا کذب   فی الحرب اشجع من لیث بخفانا

بے شک امیر مثنیٰ جنگ میں بزدل نہیں ہیں، مقام خفان کے شیر سے زیادہ بہادر ہیں[1]

جنگ مہران میں مسلمانوں کی شاندار فتح کے بعد ان کے حوصلے بلند ہوگئے اور انھوں نے عراق میں اپنی سرگرمی تیز کردی اور سودا، کسکر، خلالیج، آستانات تک کے علاقہ پر ان کا قبضہ ہوگیا۔

سوقِ بغداد پر حملہ بلاذری نے لکھا ہے کہ صلح انبار کے بعد خالد بن ولید سے ایک آدمی نے کہا کہ انبار کے بالائی علاقہ میں قرن الصراۃ کے قریب سوق بغداد کے نام سے ایک پرانا بازار ہے، جس میں کلب، بکر بن وائل اور قضاعہ کے قبائل جمع ہوتے ہیں، خالد بن ولید نے مثنیٰ بن حارثہ کو وہاں روانہ کیا، انھوں نے بازار پر حملہ کیا، تاجر سامان چھوڑ کر بھاگ گئے اور مثنیٰ بن حارثہ نے کسی کو قتل اور کسی کو گرفتار کیا،[2]

اس روایت کے مطابق یہ عہد صدیقی کا واقعہ ہے اور ابو حنیفہ دینوری نے اس کو خلافت فاروقی میں یوم مہران کے بعد یوں بیان کیا ہے کہ حیرہ کے ایک آدمی نے مثنیٰ بن حارثہ کو بتایا کہ یہاں سے قریب ایک قریہ ہے جس میں ہر ماہ بہت بڑا بازار لگتا ہے، اس میں فارس، اہواز، اور بہت سے شہروں کے تاجر جمع ہوتے ہیں، اس آدمی نے اس پر حملہ کی ترغیب دی تو مثنیٰ بن حارثہ صحرا کے راستہ سے انبار آئے اور وہاں کے مرزبان بسفروخ کو بلا کر امان دی اور کہا کہ میں سوق بغداد پر حملہ کرنا چاہتا ہوں، تم اپنے آدمیوں کو میرے ساتھ کردو،

[1] الاخبار الطوال ص ۱۱۵ [2] فتوح البلدان ص ۲۴۷۔

وہ مجھے راستہ بتائیں گے اور فرات کا پل درست کرادو تاکہ میں اس پار جاؤں، مرزبان نے حکم کی تعمیل کی اور مثنیٰ بن حارثہ دن چڑھے بازار میں پہونچ گئے، ان کے جاتے ہی بازار میں بھگدڑ مچ گئی تاجر اپنا اپنا سامانِ تجارت چھوڑ کر بھاگ نکلے، اور مسلمانوں نے سونے چاندی سے مٹھی بھری اور بہت سا مال غنیمت لیکر لوٹے[1]

اس موقع پر ایک شاعر نے کہا ہے:

وللمثنیٰ بالعال معرکۃ   شاھدھا من قبیلۃ بشر

انبار کے بالائی علاقہ میں مثنیٰ کے معرکہ کو ہر قبیلہ کے آدمی نے دیکھا ہے

کتیبۃ افزعت بوقعتھا   کسریٰ وکاد الایوان ینفطر

فوجی دستہ نے اپنی یورش سے کسریٰ کو حیران و پریشان کردیا اور ایوان کسریٰ میں دراڑ پڑنے لگی،

شجع المسلمون اذ حذروا   وفی صروف التجارب العبر

جب مسلمانوں نے کچھ توقف کیا تو انکو ابھارا گیا اور طرح طرح کے تجربات میں عبرت اور سبق ہے،

سھل نھج السبیل فاقتفروا   آثارہ، والامور تقتفر

مثنیٰ نے جنگ کا راستہ آسان کردیا تو لوگ انکے نشان پر چلنے لگے اور اچھی باتوں پر عمل کیا جاتا ہے،

ایک اور شاعر نے کہا ہے:

صبحنا بالکتائب حی بکر   وحیا من قضاعۃ غیر میل

ہم صبح کے وقت لشکر لے کر براہ راست بکر بن وائل اور قضاعہ کے پاس پہنچے،

ابحنا دارھم والخیل تردی   بکل سمیدع سامی التلیل[2]

ہم نے انکے گھروں پر یلغار کی اور گھوڑے سربلند سرداروں کو لیکر دوڑ رہے تھے،

[1] الاخبار الطوال ص ۱۱۶ [2] فتوح البلدان ص ۲۵۰۔

جنگ نخیلہ میں مہران اور بڑے بڑے ایرانی سرداروں کے مارے جانے کے بعد ایرانیوں کو اپنی کمزوری کا شدید احساس ہوا اور انھوں نے زور وشور سے جنگ کی تیاری کی، جب اس کی خبر جریر بن عبد اللہ بجلی اور مثنیٰ بن حارثہ کو ہوئی تو انھوں نے حضرت عمرؓ کو صورت حال سے مطلع کیا اور آپ نے سعد بن ابی وقاص کو عراق روانہ کیا، انھوں نے مقام ثعلبیہ میں آکر تین ماہ قیام کیا، تاکہ اطراف وجوانب کے مجاہدان کے پاس آجائیں، اس وقت مثنیٰ بن حارثہ مریض تھے، اس حالت میں بھی انھوں نے سعد بن ابی وقاص کو جنگی مشورہ دیا۔

وکان المثنیٰ بن حارثۃ مریضًا	مثنیٰ بن حارثہ مریض تھے انھوں نے
فاشار علیہ ان یحارب العدو	سعد بن ابی وقاص کو مشورہ دیا
بین القادسیۃ والعذیب	کہ قادسیہ اور عذیب کے درمیان
	دشمن سے جنگ کریں،

اس کے بعد انکے مرض نے شدت اختیار کی اور اپنے قبیلہ میں پہونچا دیے گئے جہاں انکی وفات ہوگئی اور انکی بیوی سے سعد بن ابی وقاص نے نکاح کر لیا،[1] اسکے چند دنوں بعد قادسیہ کی فیصلہ کن جنگ ہوئی جسمیں مثنیٰ بن حارثہ خود تو شریک نہیں ہوسکے مگر انکے مشورہ نے بڑا کام کیا اور انکی یاد میں سلمیٰ بنت حفصہ کی پُر تاثیر آہ "واثمناہ، لا مثنیٰ الیوم للمسلمین" نے مجاہدین کے دلوں میں جاں نثاری وجاں سپاری کا نیا جذبہ پیدا کر دیا۔

ہم نے نہایت اختصار کیساتھ عراق کی فتوحات کا ذکر کرکے مثنیٰ بن حارثہ کی خدمات کا سرسری جائزہ لیاہے، ان فتوحات و واقعات کی ترتیب اور سنین میں اختلاف سے بھی صرف نظر کیا ہے،

[1] الاخبار الطوال ص ۱۱۹، و فتوح البلدان ص ۵۵ و ص ۲۵۶۔

رمز الریاحین پر ایک تعارفی مضمون کا جائزہ

از ڈاکٹر عبد الرب عرفان

رمز الریاحین کی صنفی حیثیت

صفوی دور کے شاعر میرزا ہادی رمزی کے شعری کارنامے "رمز الریاحین" پر ڈاکٹر نور السعید اختر کا ایک تعارفی مقالہ ماہنامہ معارف کے جنوری[1] ۱۹۹۲ء کے شمارے میں اشاعت پذیر ہوا ہے، اس میں مختلف النوع غلطیاں ہیں، ڈاکٹر صاحب نے "رمز الریاحین" کو کہیں دیوان کہا ہے، کہیں مثنوی۔ تعارف کی اختتامی سطور میں رمزی کے بکھرے ہوئے اشعار نقل کرنے سے پہلے وہ اسے "کلیات" لکھ گئے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب یا تو مثنوی، دیوان اور کلیات کے فرق ہی سے ناواقف ہیں، یا "رمز الریاحین" کی صنفی حیثیت شناخت کرنے سے قاصر رہے ہیں۔

مقالے کے تیسرے صفحے کی دوسری سطر میں "رمز الریاحین" کا نام پہلی بار آیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"راقم کو پاکستان کے سفر میں رمزی کے دیوان "رمز الریاحین" کو دیکھنے کا موقع ملا" (ص ۷)

لیکن دوسری جگہ "رمز الریاحین" کے بعض مخطوطات کے ذکر اور رمزی کے

[1] معارف: زیر نظر مقالہ اسکے بعد ہی آگیا تھا مگر اشاعت کی گنجائش اب نکلی۔

حالات کی ترقیم کے بعد اس کی تصانیف کا اجمالی ذکر کرتے ہوئے پہلے ہی جملے میں فرماتے ہیں:

"رمزالریاحین کے علاوہ رمزی کی ایک اور مثنوی کا سراغ ملتا ہے۔" (ص ۱۲)

اس صاف اور واضح بیان کے مطابق "رمزالریاحین" رمزی کی مثنوی ہے۔ تقریباً تین صفحات کے بعد "رمزالریاحین" کی غایت تصنیف بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ شاہ عباس ثانی نے رمزی سے اپنے "مخصوص باغ" موسوم بہ باغ ہزارجریب" کی "توصیف و ستایش" کی فرمایش کی۔ امتثال امر میں:

"انھوں (رمزی) نے پھولوں کے مناظرے کو تمثیلی شکل دے کر مثنوی کے قالب میں ڈھال دیا۔" (ص ۱۵)

اسی سلسلۂ بیان اور اسی پیراگراف میں صرف پانچ سطروں کے فصل سے رقمطراز ہیں:

"رمزی نے اپنے دیوان کا آغاز حمد، نعت، منقبت اور معراج نامہ سے کیا۔ اسکے بعد رمزی نے بادشاہ کی بہشت آئین مجلس کی مدح میں ایک خوبصورت قصیدہ ترتیب دیا اور اس کے عوض میں معقول صلہ حاصل کیا۔ مجلس نشاط و سرور میں کیف و سرمستی لازمی چیز ہے لہذا رمزی نے بلبل خوش الحان کی زبانی عشق و عاشقی کے رموز کی عقدہ کشائی کی۔ گل و بلبل کے تذکرے کے ساتھ بادہ و ساغر، کیف و انبساط، رنگ اور ترنگ، بہار و گلفام (کذا) کے ذکر سے مثنوی کو قوس قزح بنایا۔ گل و لالہ کی مہک، ساغر و مینا کی کھنک اور ساقی گلفام کی مدح سرائی کے بعد دیوان رمزی کے اس حصے کا آغاز ہوتا ہے جو ادبی نقطۂ نظر سے اور نباتات شناسی کے

لحاظ سے نہایت اہم ہے۔" (ص ۱۶)

"رمزالریاحین" کے خطی نسخے (مخزونہ نیشنل میوزیم، کراچی) کے تعارف میں اسکے "مشمولات" کے بیان کا آغاز اس جملے سے فرماتے ہیں:

"دیوان رمزی کی ابتدا حمد و مناجات سے ہوتی ہے۔" (ص ۱۷)

مقالے کے اختتام سے کچھ پہلے "رمزالریاحین" کی وجہ تسمیہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس "نظم" میں اٹھائیس پھولوں کا ذکر ہے۔ ہر پھول دوسروں کے عیب اور خود اپنی خوبیوں اور خصوصیات کو بیان کرتا ہے:

"رمزی نے اسی مناسبت سے اپنے دیوان کا نام "رمزالریاحین" منتخب کیا۔" (ص ۲۲)

ڈاکٹر صاحب نے پورے مقالے میں "رمزالریاحین" کو تین مواد پر مثنوی اور پانچ مقامات پر دیوان کہا ہے۔ اختتامی سطور میں ارشاد ہوتا ہے۔

"خطاب اور اختتامیہ اشعار میں کلیات کے نام کی صراحت کی گئی ہے۔ (ص ۲۶)

اس کے بعد وزن اور معنی سے خالی ایک شعر[1] نقل کر کے تحریر فرماتے ہیں:

"کلیات میں اصناف سخن کی تعداد:

(۱) قصاید (۴)، (۲) غزلیں (۳)، (۳) قطعات (۲)، (۴) تمثیل (۴)، (۵) مثنوی (۱)

---

[1] شعر لفظ بلفظ کسی تصحیح کے بغیر نقل کیا جاتا ہے:

نہادم نام او را رمزالریاحین — کہ دروی ہست گوہری ناسفتہ

دونوں مصرعے ناموزوں ہیں۔ مصرع اول میں "اورا" سے "را" حذف کر دینے سے مصرع درست ہو جاتا ہے۔ مصرع ثانی ناموزوں اور بے معنی ہونے کے علاوہ پہلے مصرعے سے کوئی ربط بھی نہیں رکھتا۔ کاش ڈاکٹر صاحب قوافی پر ہی غور فرما لیتے، مگر وہ تو اسے درست سمجھتے ہیں۔

طویل مثنوی۔ در بارۂ مناظرہ گلہا (۶) رباعیات (۴) = کل = ۱۸" (ص ۲۶)

ملاحظہ فرمائیں، رمزی کا کارنامہ "رمز الریاحین" مقالے کے اس مرحلے میں مثنوی اور دیوان کے بجائے "کلیات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

"رمز الریاحین" کی حقیقی صنفی حیثیت کا جواب "قصص الخاقان" سے مقتبس اس طویل عبارت میں موجود ہے جسے ڈاکٹر صاحب نے خود رمزی کے حالات کے ضمن میں نقل کیا ہے۔ اگر وہ اس جملے پر کہ:

".... دو مثنوی کہ ہر یک ثانی ندارد موسوم بہ رمز الحقائق و رمز الریاحین
قریب چہار ہزار بیت از نظر این ذرہ احقر رسیدہ" (ص ۹)

غور فرما لیتے تو اس غلطی کے ارتکاب سے بچ جاتے۔

یہ تو رمز الریاحین کے مثنوی ہونے کا خارجی ثبوت ہوا۔ داخلی ثبوت اسکی بحر اور ہیئت سے عبارت ہے۔ پوری کتاب اپنے لوازمات کے ساتھ (جن پر ڈاکٹر صاحب کو مختلف اصناف کا گمان ہوا) ایک بحر (یعنی بحر ہزج مسدس مقصور/ محذوف۔ مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل/فعولن) میں ہے۔ نیز غزلیں (جو تعداد میں صرف تین ہیں) کے استثنا کے ساتھ پوری کتاب مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ ایسی کتاب کو جس میں چار قصیدے، تین غزلیں، دو قطعے، ایک مثنوی اور چار رباعیاں شامل ہوں، مشمولات کے متحد البحر اور مثنوی کی ہیئت میں ہونے کی بات نظر انداز کرنے کے باوجود کلیات تو کجا، دیوان بھی کہنا صحیح نہیں ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے "رمز الریاحین" میں مشمولہ ابیات کی تعداد تخمیناً بھی بیان نہیں فرمائی لیکن ان کے لکھنے کے بموجب صفحات ۱۳۸ ہیں اور ہر صفحے پر سطروں کی

تعداد ۱۸ ہے۔ اس حساب سے سطروں کی کل تعداد (۱۳۸ × ۱۸) = ۲۴۸۴ قرار پاتی ہے۔ اس میں سے ان سطروں کو جو عنوانات پر مشتمل ہیں منہا کر کے ابیات کی تعداد معلوم کی جا سکتی ہے لیکن چونکہ مقالے سے نہ عنوانات کی تعداد کا علم ہوتا ہے نہ عنوانات سے گھرنے والی سطروں کا، لہٰذا ایک محتاط اندازے کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ رمز الریاحین میں ابیات کی تعداد دو ہزار سے قدرے متجاوز ہوگی۔ اس قیاس کو رمزی کی دوسری مثنوی رمز الحقائق میں مشمولہ تعداد سے جو ڈاکٹر صاحب کے بقول "دو ہزار سے زائد" ہے[1]، تقویت پہنچتی ہے۔ ولی قلی خاں نے دونوں مثنویوں کی مجموعی تعداد "قریب چار ہزار بیت" تحریر کی ہے[2]۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک اور قیاس پر مبنی بیان بھی اسی نوعیت کا اور غور طلب ہے، رمزی کی تصانیف کے ذیل میں تحریر فرماتے ہیں:

"رمزی کی غزلیات کے منتخبہ اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ رمزی کی غزلیات
اور دیگر اصناف پر مبنی علیحدہ دیوان یقینی ہے[3]"۔

کاش رمزی کے "علاحدہ دیوان" کی موجودگی کے امکان کو قیاس کرنے سے پہلے قصص الخاقان کی طویل عبارت کے صرف درج ذیل جملے کو ملاحظہ فرما لیتے جس کو انھوں نے خود ہی نقل کیا ہے تو انہیں قیاس سے کام لینے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ قصص الخاقان کا جملہ یہ ہے:

"ابیات مدون او کہ سن شریفش از سی متجاوز (؟)[4] از دہ ازدہ ہزار متجاوز است[5]"

---

[1] معارف، جنوری ۱۹۹۲ء: ص ۱۲ [2] ایضاً: ص ۹ [3] ایضاً: ص ۱۲ [4] فقرہ اسی طرح نقل کیا گیا ہے۔ [5] معارف، جنوری ۱۹۹۲ء: ص ۹۔

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ جب رمزی کی عمر تیس سال سے متجاوز تھی تو اس کے بارہ ہزار سے متجاوز ابیات "مدون" ہو چکے تھے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر رمزالریاحین کو ڈاکٹر صاحب کے ارشاد کے بموجب "کلیات" تسلیم کر لیا جائے تو مثنوی رمزالحقایق (جس کے موجود و محفوظ ہونے کا علم خود ڈاکٹر صاحب کی تحریر سے ہوتا ہے[1]) اور دیوان غزلیات کے دستیاب متفرق اشعار کس مد میں شمار کیے جائیں گے؟ کلیات دوم؟؟ اور اگر ہر دو "کلیات" کو یکجا کر دیا گیا تو اسے کیا کہیں گے؟

مبینہ اصناف کی حقیقت | ڈاکٹر صاحب کا زیر تبصرہ مقالہ رمزالریاحین کی اصناف سخن کے بارے میں بھی ان کی ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے مثنوی رمزالریاحین میں (جسے کہیں دیوان، کہیں مثنوی اور آخر میں کلیات کہا ہے) مشمولہ اصناف سخن کی تعداد کچھ اس طرح بیان کی کہ "کل ۱۸"[2] پر اصناف کی تعداد کا گمان گزرتا ہے لیکن اصناف کے اعداد و شمار پر مبنی ان کے مختصر سے بیان کو بغور پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے چھ اصناف میں مندرجات کی مجموعی تعداد "کل ۱۸" تحریر فرمائی ہے۔ سطور ذیل میں ان اصناف کی حقیقت پیش کی جاتی ہے:

قصیدہ | "کلیات" رمزی کے مشمولات میں ڈاکٹر صاحب نے جن اصناف کی نشاندہی فرمائی ہے ان میں پہلا قصیدہ ہے۔ قصیدہ وہ صنف ہے جس کا موضوع مدح ہے مگر بیان کے لیے ہیئت کی ایک مخصوص قبا متعین ہے۔ اس کی پابندی

۱؎ معارف، جنوری ۱۹۹۲ء: ص ۱۲ ۲؎ ایضاً: ص ۲۶۔

کیے بغیر کسی مدحیہ نظم پر قصیدے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ قصیدے کا پہلا شعر مطلع ہوتا ہے اور بقیہ اشعار مطلع ہی کی ردیف اور قوافی میں ہوتے ہیں۔ اسکے اجزائے ترکیبی تشبیب، گریز، مدح، حسن طلب اور دعا سے عبارت ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کو جن اشعار پر قصیدوں کا گمان ہوا۔ سب مثنوی کی ہئیت میں ہیں اور رمزالریاحین کے اجزائے لاینفک ہیں۔ انھیں مثنوی سے علیحدہ تصور کرنا اور قصیدوں سے تعبیر کرنا لغو ہے۔ شاہ عباس ثانی کے "عدل واحسان" کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کے مبینہ اور متصورہ قصیدے کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے[1]:

بدور اینچنیں شاہ جوان بخت، کہ برخوردار بادا زتاج وازتخت[2]

یہ قصیدے کا مطلع ہے، مثنوی کی بیت ہے جو مفہوم کے لحاظ سے نامکمل ہے۔ دوسرا مصرع جملۂ معترضہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے قصیدے کا شعر قرار دینا صنف قصیدہ سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔

غزل | اس کارنامے میں ڈاکٹر صاحب نے تین غزلوں کی شمولیت کا ذکر کیا ہے ان کے موارد درج ذیل ہیں:

(۱) حمد، نعت اور معراج نامے کے بعد "نعتیہ غزل" کی ضمنی سرخی کے ذیل میں یہ بیت درج ہے:

ازین خوشتر بگو رمزی دمادم کہ دریابی مراد ہر دو عالم[2]

(۲) "غزل در تعریف عشق از زبان بلبل":-

۱؎ معارف، جنوری ۱۹۹۲ء: ص ۱۸ ۲؎ ایضاً: ص ۱۸۔

بیا ای شیخ در کاشانۂ عشق — ببین روح القدس پروانۂ عشق
جو از بلبل مرد من ؟) این ابیات رمزی — شنیدم جملہ از افسانۂ عشق[1]

(۳) "غزل از رمزی :

بیا ای شاہباز کبک رفتار — گذاری کن بسوی این گرفتار
بیا جانا کہ رمزی را شگفتہ — گل آشفتگی بر طرف دستار[2]

ردیف و قوافی کے التزام سے ظاہر ہے کہ یہ اشعار غزل کے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی ان کا ایک ہی بحر میں ہونا اور لب و لہجہ عام غزلوں سے مختلف (یعنی بیانیہ) ہونا دلیل ہے اس امر کی کہ یہ غزلیں مثنوی میں ضم ہیں ان کی سرخیوں سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔

قطعات | رمزالریاحین میں قطعات کی تعداد دو[2] بیان کی گئی ہے۔ قصیدے اور غزل کی طرح ہیئت کے لحاظ سے قطعے کے لیے بھی ایک ظاہری ساخت متعین ہے۔ اس میں مطلع نہیں ہوتا، صرف اشعار ہوتے ہیں جن کے مصرعہائے ثانی میں (اگر مردف ہو تو) ردیف اور قوافی کی (اور غیر مردف ہو تو) صرف قوافی کی پابندی کی جاتی ہے۔ تعداد اشعار اتنی ہوتی ہے جتنی کسی مضمون کو تسلسل کے ساتھ بیان کرنے کے لیے درکار ہو، لہٰذا قطعہ دو[2] شعر کا بھی ہو سکتا ہے اور دو[2] سے متجاوز اشعار کا بھی۔ رمزالریاحین کے جن دو[2] حصوں کو قطعہ کہا گیا ہے ان میں سے ایک کے دو[2] شعر نقل کیے گئے اور دوسرے کا صرف ایک شعر۔ پہلا "قطعہ نصیحت آمیز از زبان بلبل" درج ذیل اشعار سے

[1] معارف، جنوری ۱۹۹۲ء: ص ۲۱-۲۰ (مفہوم نامکمل ہے غالباً یہ شعر، شعر مابعد کے ساتھ قطعہ بند ہے۔ [2] ایضاً: ص ۲۱۔

شروع ہوتا ہے :

نظر از غیر جاناں بایدت دوخت — نظربازی ز نرگس بایدآموخت
کہ ہرگز غیر یارش در نظر نیست — ز گلزار (و) ز گلچینش خبر نیست[1]

یہ اشعار مثنوی کی ہیئت میں ہیں۔ "قطعے" کے بقیہ اشعار بھی یقیناً اسی ہیت میں ہوں گے۔ اس مجموعۂ اشعار کو قطعہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے اصناف سخن کے بارے میں اپنی عدم واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔

تمثیل | ڈاکٹر صاحب نے رمزالریاحین میں تمثیل کی تعداد چار تحریر فرمائی ہے!!! کیا یہ بات حیرت انگیز نہیں ؟ تمثیل سے ڈاکٹر صاحب کی مراد کیا ہے، انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔ لکھتے ہیں :

"ایک مرتبہ شاہ عباس ثانی نے رمزی کو اصفہان کے باغات کی سیر کو مدعو کیا۔ بادشاہ نے اپنے مخصوص باغ کی توصیف و ستایش کی درخواست کی ..... رمزی نے باغ ہزار جریب کی انوکھے پیرائے میں تعریف کی۔.... انھوں نے پھولوں کے مناظرے کو تمثیلی شکل دے کر مثنوی کے قالب میں ڈھال دیا"[2]

پھولوں کا مناظرہ خود تمثیل ہے، پھر اسے تمثیلی شکل دینے کے کیا معنی ؟ حقیقت یہ ہے کہ رمزالریاحین نہ دیوان ہے نہ کلیات، بلکہ فتاحی کی "دستور عشاق" کی طرح ایک رمزیہ مثنوی ہے۔ تعجب ہے ڈاکٹر صاحب جیسے

[1] مضمون میں مصرع یوں نقل ہوا ہے ع ز گلزار ز گلچینش خبر نیست (ص ۲۱) مگر یہ کاتب کی غلطی ہے [2] معارف جنوری ۱۹۹۲ء: ص ۱۵۔

وسیع تدریسی تجربہ رکھنے والے اعلا سند یافتہ استاد کیوں اس کی شناخت سے قاصر ہے۔

اشعار و ابیات پر ایک نظر

مضمون میں اشعار و ابیات نہایت فراوانی مگر بے احتیاطی کے ساتھ نقل کیے گئے ہیں۔ ان پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مخطوطوں کو صحت کے ساتھ پڑھنے کے عادی نہیں ہیں اسی لیے نقل مطابق اصل کا اصول اپنایا ہے۔ عام طور پر جو مخطوطے اصل سے نقل در نقل تیار کیے گئے ہیں ان میں بکثرت کی صورت مسخ ہو گئی ہے۔ ان میں بعض کی مسخ شدہ مکتوبی صورت خود صحیح قرأت کی طرف اشارہ کر دیتی ہے۔ شعور و وجدان کی رہنمائی میں قدرے غور و فکر سے کام لے کر ایسے الفاظ کی تصحیح کی جا سکتی ہے۔

مضمون "رمز الریاحین" کے منقولہ ابیات و اشعار میں بیشتر غلط قرأتوں کے حامل ہیں۔ ان کی ایک معتد بہ تعداد کو تھوڑے سے غور و فکر کے ساتھ درست "منشائے مصنف" کے قریب تر اور بعض کو پورے اعتماد کے ساتھ "منشائے مصنف" کے عین مطابق کیا جا سکتا ہے۔ سطور ذیل میں ایسے تمام اشعار و ابیات کو زیر تبصرہ مضمون سے بجنسہٖ نقل کر کے ان کا جائزہ لیا جاتا ہے:

(۱) جد و پدر ترا ست سال تاریخ ظل اللہ و ظل حق و ظل معبود (ص ۵ ح ۱)

اس شعر کے ساتھ قوسین میں ۹۹۴ھ/ ۱۰۳۸ھ/ ۱۰۵۲ھ درج ہیں لیکن پہلے مصرعے میں شاہ عباس ثانی کے جد اور پدر (شاہ عباس اول اور شاہ صفی) کا ذکر ہے جن کے سالہائے جلوس "ظل اللہ" اور ظل حق سے علی الترتیب ۹۹۴ (؟) اور ۱۰۳۸ھ برآمد کیے گئے ہیں۔ شعر کی موجودہ صورت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ تیسرا مادۂ تاریخ کس کا سال جلوس ہے۔ اگر "پدر" کے بعد ایک واو عطف کا اضافہ کر دیا جائے تو تیسرا مادہ خود شاعر کے مخاطب شاہ عباس ثانی کا سال جلوس قرار پاتا ہے۔ دوسری محل نظر بات یہ ہے کہ "ظل اللہ" سے سال ۹۹۴ھ نہیں ۹۹۶ھ برآمد ہوتا ہے۔ (باقی)

عبّاس محمود العقاد

از جناب ابوسفیان اصلاحی

(۳)

یہ غلط ہے کہ مرد تمام معاملات میں عورتوں کے مانند اور ان کے ہم پلہ ہیں بیشمار ایسے امور ہیں جن میں دونوں کے درمیان کھلا ہوا تفاوت ہے۔ دونوں کی ساخت، چہرہ کی بناوٹ، آواز کی لطافت اور دماغی حجم میں واضح فرق ہے۔ ایک عورت کو اپنے جسم کی ستر پوشی کے لیے جن چیزوں کی حاجت ہے اس کی ایک مرد کو ضرورت نہیں ہوتی۔ عورت کے شکم اور غذا میں بھی اختلاف ہے اور دونوں کے اخلاق و جذبات میں بھی یکسانیت نہیں۔ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ دونوں کے قوی اور استعداد و صلاحیت میں کوئی فرق نہیں ہے، وہ وہم و گمان میں مبتلا ہیں[1] جب دونوں کے جسم کی ساخت میں فرق ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا اثر لازماً معاشرتی زندگی پر بھی پڑے گا۔ مرد جن معاشرتی امور کو انجام دے سکتا ہے انہیں عورت انجام نہیں دے سکتی۔[2] اس کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ میں مرد کے مقابلے میں ایک عورت کو حقیر تصور کرتا ہوں میرا مقصد تو یہ ہے کہ دونوں کے حقوق کیا ہیں؟ اگر وہ اپنے فرائض سے غافل رہے تو معاشرہ تباہیوں سے دوچار

---

[1] مطالعات فی الکتب والناس ص ۱۵۴ - ۱۵۵ [2] ایضاً ص ۱۵۶ -

ہو جائے گا۔[1]

ہم کو عقاد کی اس صراحت کو تسلیم کرنے میں تامل ہے، ان کے دوسرے مقالات اور کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرد کے مقابلہ میں عورت کو کمتر سمجھتے ہیں، انھوں نے اس کی تائید میں قرآن کریم سے شہادت بھی پیش کی ہے۔ اپنی کتاب "ھذہ الشجرۃ" میں آدم و حوا کے جنت سے اخراج کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے عورت کو مورد الزام قرار دیتے ہیں۔[2] اس کے علاوہ ابو العلاء کے خیالات پر تبصرہ کرتے ہوئے بھی عورت کو صرف تحفظ نسل کا ذریعہ بتاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عورت تضاد، منافقت اور فریب کاری کا مجموعہ ہے۔ اسکے یہاں اخلاقی عیوب قدم قدم پر ملیں گے۔[3]

عورتوں ہی سے متعلق ایک دوسرے مضمون "صفات المرأۃ" میں عقاد نے بتایا ہے کہ پیدائشی اور معاشرتی لحاظ سے دونوں میں فرق کے باوجود بعض چیزوں میں عورتیں مردوں سے آگے ہیں، اس پر تمام لوگوں کا اتفاق ہے کہ مرد کے مقابلے میں ایک عورت زیادہ حسین و جمیل ہوتی ہے، قدرت نے اسے دنیا کا ایک خوبصورت نمونہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اسے اشیا کی لطافت و ملاحت کا زیادہ اندازہ ہے۔[4] جو لوگ عورتوں کی تنقیص کرتے ہیں وہ بھی یہ مانتے ہیں کہ انکے اندر فطرت نے عجیب طرح کی کشش اور جاذبیت رکھی ہے، ان کی مقناطیسی قوت کی وجہ سے اصحاب زہد بھی انکے دام میں پھنس جاتے ہیں۔ مردوں کے مقابلے میں

[1] مطالعات فی الکتب والناس ص ۱۵۶ [2] عباس محمود العقاد۔ ہذہ الشجرہ ص ۳ [3] مطالعات فی الکتب والناس ص ۱۵۶ [4] ایضاً ص ۱۶۱۔

وہ عورتوں کو رقت و مودت، رحمت و لطافت اور عفو و درگذر میں بھی مردوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ فطرت نے ان کے دلوں کو رحم و کرم سے معمور کیا ہے۔[1] دنیا کی ہر زبان کے ہر ادب میں اس کا ذکر ہے کہ عورتیں رقیق القلب، زود رنج، رحم دل اور شوہروں کے مقابلے میں زیادہ غمگسار ہوتی ہیں۔ ایک ماں اپنے بچوں کے ساتھ شفقت کے جن جذبات کا اظہار کرتی ہے وہ باپ کے یہاں معدوم ہوتے ہیں

سیاسی مقالات

عقاد کے سیاسی مقالات سے واضح ہوتا ہے کہ انہیں اپنے وطن اور اپنے معاشرے سے کس قدر تعلق خاطر تھا اور وہ معاشرہ کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے کس حد تک فکر مند رہتے تھے۔ وہ اپنے ملک اور اپنے وطن کو اعلیٰ مقام پر دیکھنا چاہتے تھے۔ اس طرح کے خیالات ان کے اندر اسلیے پیدا ہوئے تھے کہ وہ عبدہ، افغانی اور سید عبداللہ ندیم کی تحریروں سے بہت متاثر تھے۔ ان لوگوں کی زندگی اصلاحی کاموں کے لیے وقف تھی۔ شیخ محمد عبدہ کے اثر سے انھوں نے تفکر و تدبر اور عقلیت پسندی پر زور دیا۔ اپنی کتاب "التفکیر فریضۃ اسلامیۃ" میں غور و خوض پر بڑا زور دیا ہے۔ عقاد نے معاندین اسلام کے اعتراضات کے جوابات دینے کے لیے "حقائق الاسلام واباطیل خصومہ" "وما یقال عن الاسلام" اور "الدیمقراطیۃ فی الاسلام" وغیرہ جیسی تصانیف لکھیں۔

عقاد طبیعتاً رقیق القلب تھے، انہیں غربا و فقراء سے بڑی محبت تھی،

[1] مطالعات فی الکتب والناس ص ۱۶۴۔

اپنے انہی جذبات کا اظہار مقالہ "جنون المال" میں کیا ہے۔ انھوں نے ظلم و بربریت کے خلاف ہمیشہ آواز بلند کی۔ ذخیرہ اندوزی سے انہیں سخت نفرت تھی۔ مادی منفعت اور شہرت و منصب کی طلب سے ہمیشہ دور رہے۔[1] عقاد نے اپنا فلسفۂ زندگی بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ میری زندگی کا سب سے اہم پہلو وہ ہے، جسے میں نے وراثتاً حاصل کیا اور میرے ذاتی تجربات اور مطالعہ نے اس میں مزید وسعت پیدا کی۔ اس فلسفہ سے مراد یہ ہے کہ مجھے مادی چیزوں سے نفرت رہی اور مجھے ایسے لوگوں پر شدید حیرت ہے جو مادیت اور جاہ و منصب کے حصول میں خود کو فراموش کر بیٹھے ہیں۔[2] ان دنوں دولت جمع کرنے کا جنون لوگوں پر طاری ہے، اس کی وجہ سے وہ اپنی حیثیت اور اخلاقی قدروں کو فراموش کر بیٹھے اور گمراہی میں مبتلا ہوگئے ہیں، مادہ پرست لوگ نازیبا حرکتوں اور جرائم کے مرتکب ہوجاتے ہیں۔ اس جنون کے شکار خود کو ہدایت یافتہ تصور کرتے ہیں اور اسے اپنا مقدر قرار دیتے اور حصول زر میں ہر وقت سرگرداں رہنا اپنا فریضہ خیال کرتے ہیں۔[3]

مال و زر ہر دور میں محبوب رہا ہے لیکن آج اس کے حصول کے لیے جو جنون لوگوں پر سوار ہے وہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ جاہ و منصب اور مال و دولت کے لیے تمام اخلاقی قدریں پس پشت ڈال دی گئی ہیں۔[4] انکے نزدیک مال و دولت کی محبت میں غلو کرنے والے لائق ملامت ہیں۔ انکے

[1] انا ص ۱۱۴ [2] ایضاً ص ۱۶۲ [3] علی الاثیر ص ۸۴ [4] ایضاً ص ۷۹۔

خیال میں یہ دنائت، پستی اور سطحیت جنگ عظیم کے بعد یا اثنائے جنگ عظیم میں پیدا ہوئی جس نے لوگوں کو حریص و طامع بنا دیا ہے، جنگ عظیم کی وجہ سے دولت و ثروت کے مالک نااہل لوگ ہوگئے ہیں جو فحاشی اور برائی کا سد باب کرنے کے بجائے ان کو خوب عام کر رہے ہیں اور اس کے لیے تمام وسائل و ذرائع بھی استعمال کر رہے ہیں۔[1] اقتدار پر اگر نااہلوں کا قبضہ ہوجائے تو معاشرہ میں برائیاں جڑ پکڑ لیتی ہیں اور ہر طرف ظلمت و تاریکی چھا جاتی ہے۔

وہ اپنی ہی طرح دوسروں میں بھی ملک و وطن کی بے لوث محبت کے جذبات پروان چڑھانے میں مصروف رہے انھوں نے اپنے ایک مقالہ "الحقوق والواجبات" میں ان لوگوں کو ہدف تنقید بنایا ہے جو اپنے فرائض سے غفلت برتتے ہیں اور صرف اپنے حقوق و مطالبات کی باتیں کرتے ہیں۔ عقاد کا خیال ہے کہ ایسا انہی ملکوں میں ہوتا ہے جہاں کے لوگ اپنے فرائض و واجبات کو پس پشت ڈال دیتے ہیں، جس ملک اور شہر کے باشندے اپنے فرائض کی انجام دہی میں چاق و چوبند ہوتے ہیں وہاں مطالبات اور حقوق کے مسائل سر نہیں اٹھاتے۔ وہ معروف مصری قائد سعد زغلول کے حوالے سے کہتے ہیں کہ ہمارے ملک کی تشویشناک صورت حال یہ ہے کہ ہم اپنے فرائض سے تو غافل ہیں لیکن دوسروں کا محاسبہ خوب کرتے ہیں۔[2]

ہر شخص دوسروں سے یہ درخواست کرے کہ وہ اسے اس کے فرائض سے آگاہ کرے اور دوسرے کو اس کے فرائض کی طرف توجہ دلانے سے قبل

[1] علی الاثیر ص ۵۱ [2] ایضاً ص ۱۴۵۔

خود اپنے فرائض کی انجام دہی میں دیانت داری سے کام کرے، اگر اس مزاج و ذہن کے افراد پیدا ہو جائیں تو مطالبات اور حقوق کے مسائل ہی ناپید ہو جائیں گے کیونکہ جب تمام افراد اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مشغول رہیں گے تو یہ روزانہ کے احتجاج، ہڑتالیں اور جلسے جلوس خود بخود ختم ہو جائیں گے[1]

آج ملک کے باشندے حکومت سے اپنے مطالبے کر رہے ہیں حکومت کو ان کے مطالبات پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے، لیکن مطالبات سے کوئی حاصل نہیں جبکہ مطالبہ کرنے والے خود اپنی ذمہ داریوں اور واجبات سے کنارہ کش ہوں اور وطن کے تقاضوں اور مطالبات پورا کرنے سے غفلت برت رہے ہوں[2] اس وقت مطالبات کی آواز تو ہر طرف گونج رہی ہے جبکہ ہر شخص دوسروں کے حقوق کو غصب کیے ہوئے ہے[3]

عقاد اپنے ملک کے لیے اپنے دل میں دردمندی کا گوشہ رکھتے تھے اور اس سے منافقت، بے وفائی اور غداری کو ناپسند کرتے تھے۔ انھوں نے درمے دامے سخنے وطن کی خدمت انجام دی۔

اسلوب عباس محمود العقاد کی تحریروں میں فلسفیانہ عناصر کا امتزاج ہے، اس طرز کو اپنانے کی وجہ سے انھوں نے ایسے نتائج نکالے جو عام مقالہ نگاروں کے ذہن میں نہیں آسکتے، وہ انگریزی ادب سے واقف تھے اس لیے کم سے کم الفاظ میں بات کہنے کے عادی تھے۔ انھوں نے ہمیشہ عبارت سے زیادہ

۱؎ علی الاثیر ص ۱۴۶ ۲؎ ایضاً ص ۱۴۶ ۳؎ ایضاً ص ۱۴۷۔

مفہوم پر زور دیا ہے، ان کے نزدیک ادیب کو الفاظ اور جملوں کی تزیین و آرائش کے پیچھے پڑ کر مفہوم کو قربان نہیں کرنا چاہیے[1]

وہ کسی موضوع پر قلم اٹھانے سے پہلے اس کے فروعات پر خوب غور و خوض کر لیتے اور اپنے ذہن میں اس کی باقاعدہ ترتیب دے لیتے، اس کے بغیر وہ اس پر اظہار خیال کو پسند نہیں کرتے تھے[2]

عقاد کی تحریر ان کے فکر و خیال سے مربوط ہوتی تھی۔ طرز تحریر اور موضوع میں ہم آہنگی کے بغیر ادب میں کسی تحریر کی کوئی جگہ نہیں ہوتی[3]

ان کی تحریر بالعموم پیچیدہ اور مشکل ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ موضوع کے لحاظ سے زبان و بیان استعمال کرتے ہیں وہ ادیب کے ساتھ مفکر اور فلسفی بھی تھے اس لیے انھوں نے زیادہ تر فلسفیانہ موضوعات کے مناسب زبان استعمال کی ہے، لیکن بہت سے مقالات میں انھوں نے آسان اور عام فہم زبان بھی استعمال کی ہے، اس قسم کی تحریروں میں سلاست و روانی ہوتی ہے۔

عقاد نے ہر جگہ موضوع کے مناسب اسلوب اختیار کیا ہے، ان کا خیال ہے کہ زبان کی سادگی کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ متبذل، سوقیانہ اور غیر معیاری ہو، حقیقت یہ ہے کہ عقاد کی زبان دوسرے ادیبوں کے مقابلے میں مشکل ضرور ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی عبارتوں کے

۱؎ فی الادب الحدیث ۲/ ۱۹ ۲؎ انا ص ۹۵ ۳؎ یومیہ ص ۱۰۵ ۴؎ بین الکتب والناس ص ۲۱۰ و ۲۱۱۔

دامن میں افکار و خیالات اور معلومات کا وسیع ذخیرہ ہوتا ہے، اگر پڑھنے والے کا ذوق بلند نہ ہو تو وہ ان کے فن و ادب کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا، عقاد کو جتنا ہی پڑھا جائے اتنا ہی ان کے فن کی خوبیاں نمایاں ہوتی ہیں، ان کے الفاظ اور جملوں میں چاہے چمک دمک نہ ہو لیکن وہ جن لفظوں سے اپنے جملوں کو ترتیب دیتے ہیں ان سے زبان پر ان کی گرفت کا اندازہ ضرور ہوتا ہے[1]

عقاد ایک منطقیانہ اسلوب کے مالک ہیں، وہ مقدمات و نتائج پر بنیاد رکھتے ہیں، ان کے مقالات سے یہ بات عیاں ہے کہ ان کے افکار و خیالات میں ایک ترتیب ہوتی ہے۔ آغاز سے اختتام تک کسی کمی کا احساس نہیں ہونے دیتے، یہی ایک علمی اسلوب کا معیار ہے۔ لیکن یہی اسلوب جب وہ ادبی موضوعات میں اختیار کرتے ہیں تو یہ ادبی اسلوب بن جاتا ہے۔

عقاد کے اسلوب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں تحقیق و تنقید اور غور و خوض کے اثرات نمایاں ہیں اور یہی انکی انفرادیت ہے[2]

---

[1] فکر و نظر (جنوری۔ مارچ ۱۹۸۰ء) ص ۴۶ [2] عقاد دراسۃ و تحیۃ ص ۱۱۹۔

سوئے حرم

از ضیاء الدین اصلاحی

(۴)

عورتوں کے حقوق حجۃ الوداع کے خطبہ میں آپؐ نے عورتوں کے حقوق کی ادائیگی پر بڑا زور دیا تھا اور لوگوں کو ان کے بارے میں اللہ سے ڈرنے کی تاکید فرمائی تھی۔ ناقص الایمان لوگ جو آزادیٔ نسواں کے علمبردار ہیں یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ اسلام نے ان پر ظلم و زیادتی کی ہے اور ان کے حقوق سلب کر لیے ہیں حالانکہ اسلام نے تو ان کو جاہلیت کے رسم و رواج سے چھٹکارا دلایا اور وراثت میں انکا حصہ بھی متعین کیا۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا
وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ
(نساء: ۳۲)

مردوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو انھوں نے کمایا اور عورتوں کو حصہ ملے گا اس میں سے جو انھوں نے کمایا۔

قرآن مجید میں عورتوں کے حقوق کے سلسلہ میں کہا گیا ہے:۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ
بِالْمَعْرُوفِ (بقرہ: ۲۲۸)

اور عورتوں کے لیے دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں جس طرح

ان پر ذمہ داریاں ہیں۔

قرآن مجید نے ان کو گھر کی مالکہ اور نگراں بنایا اور انہیں وہ درجہ دیا جو انکے واقعی شایانِ شان تھا، جو لوگ عورتوں کی آزادی کے لیے بیجا جوش و خروش دکھاتے ہیں وہ انہیں ایک بازاری اور بکاؤ مال اور حقیر و بے قیمت سامان بنانا چاہتے ہیں، مسلمانو! اسلام کی نعمت اور اپنے خیر امت ہونے پر خدا کا شکر بجا لاؤ اور دین سے جڑ کر اس کے احکام پر عمل کرو، اسی میں تمہاری فلاح ہے۔

اخوت اور بھائی چارگی

دین حنیف تمہیں الفت و محبت اور وحدت کلمہ کی دعوت دیتا ہے، اختلاف اور فرقہ آرائی سے بچنے کی تاکید اور اس کے نتائج بد سے آگاہ کرتا ہے۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران: ۱۰۳)
اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑو اور پراگندہ نہ ہو۔

وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ (انفال: ۴۶)
اور آپس میں اختلاف نہ کرو کہ تم پست ہمت ہو جاؤ اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے۔

وہ تمہیں قتل و خوں ریزی اور ایک دوسرے پر ظلم آرائی سے روکتا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ بعض بعض کو تہ تیغ کرنے لگے"۔

اسی دین حنیف کو اختیار کرکے تمہیں دوسروں پر علو و غلبہ حاصل ہو سکتا ہے۔

وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ
اور پست ہمت نہ ہو اور غم نہ کرو،

الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران: ۱۳۹)
اگر تم مومن ہو تو تمہی غالب رہوگے۔

امت اسلامیہ کے لیے یہ ہرگز روا نہیں ہے کہ وہ باہم قتل و خوں ریزی کرے، ایک دوسرے کے خلاف مکر و سازش کرے اور بعض بعض کی مصیبت اور پریشانی سے خوش ہو، یاد رکھنا چاہیے کہ امت کے اختلاف و افتراق میں دشمنوں کا فائدہ ہے، ہمارے دشمن یہی چاہتے ہیں کہ ہمارے اندر قتل و خون کا بازار گرم رہے تاکہ وہ اپنے ہلاکت آفریں اسلحے اور تباہ کن ہتھیار ہمیں فروخت کریں اور ہمارا ہی ایک گروہ دوسرے گروہ کے سینوں میں یہ ہتھیار پیوست کرتا رہے۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ دشمنوں کی ان سازشوں کو ناکام بنا دیں جس کی صورت یہ ہے کہ ہم ایک امت مسلمہ بن جائیں اور اپنی شیرازہ بندی کرلیں، اپنے مسائل و مشکلات کو خود باہم مل جل کر حل کریں اور بر و تقویٰ میں ایک دوسرے کے معاون بن جائیں۔

حج بیت اللہ

حجاج کرام! اللہ کا یہ مقدس گھر روئے زمین کا سب سے بہتر حصہ ہے، آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے روز ہی سے اللہ نے اسے محترم بنایا ہے، یہ شہر بھی ابتدائے آفرینش سے مقدس و محترم ہے، اس لیے یہاں قتل و خوں ریزی نہ کی جائے، شکار کے جانور نہ مارے جائیں، کسی کا پڑا ہوا مال و اسباب نہ اٹھایا جائے، عمر بھر میں ایک بار ہر مسلمان پر اس کی زیارت لازم ہے، اس کے قصد سے گناہ محو ہو جاتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے حج کیا اور وہ شہوانی اور فاسقانہ باتوں سے بچا تو وہ

ماں کے پیٹ سے اپنے پیدا ہونے کی طرح گناہوں سے دھل گیا۔

اللہ نے اس بلد امین کا محافظ اور امانت دار اہل لوگوں کو بنایا ہے، وہ اخلاص سے بیت اللہ اور سرزمین حرم کی خدمت کرتے اور حاجیوں کو ہر قسم کا امن، راحت اور سہولت بہم پہنچاتے ہیں، جس کو آپ لوگ خود محسوس کر سکتے اور دیکھ سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے، اس کا شکر ہے کہ اس ملک کے قائدین صحیح دین وعقیدہ پر قائم ہیں، اللہ کی کتاب اور سنت نبوی ﷺ کے مطابق یہاں شریعت کے احکام نافذ اور حدود اللہ جاری ہوتے ہیں، حکمرانوں کو امت کی اصلاح اور اس کی شیرازہ بندی عزیز ہے، ان کا دستِ تعاون ساری دنیائے مسلمانوں کے لیے پھیلا رہتا ہے، وہ ہر خطہ کے حاجیوں کو خوش آمدید کہتے اور حج وعمرہ کے ارکان کی ادائیگی میں انہیں سہولت بہم پہنچاتے ہیں۔ آج عرفہ کے دن پہلے اللہ کو یاد کیجیے اور اسلام کی نعمت پانے اور آپ کو اس شہر تک اللہ کے پہنچانے پر اس کا شکر ادا کیجیے، نیک اعمال سے اس کا تقرب حاصل کیجیے، لغو و باطل سے پرہیز کیجیے۔

فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ (بقرہ : ۱۹۷)	حج کے مہینوں میں جو کوئی حج کا عزم کرے تو پھر اس کے لیے حج تک نہ شہوت کی کوئی بات کرنی ہے، نہ فسق وفجور کی، نہ لڑائی جھگڑے کی۔

اس لیے جدال بالباطل اور بری باتوں سے بچیے اور اپنے حج وعمرہ کو صرف اللہ کے لیے خالص کیجیے، حج کی پاکیزگی کو قائم رکھیے، گناہ اور ناپاکی کے کاموں سے

حج کی حرمت پر بٹہ نہ آنے دیجیے، حلم وصبر کو اپنا شیوہ بنائیے، ایک بھائی دوسرے بھائی کو گزند نہ پہنچائے، مسلمان وہی ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا حجۃ الوداع

نبی اکرم ﷺ نے ایک بار حج کیا جو حجۃ الوداع کہلاتا ہے، یہ سنہ ۱۰ھ میں ہوا، ہر مسلمان کو اپنے حج وعمرہ میں آپ ہی کی اقتدا کرنی چاہیے تاکہ اس کا حج درست اور مطابق سنت ہو۔ ۹ ذی الحجہ کو آپ آفتاب کے طلوع کے بعد عرفہ کے لیے روانہ ہوئے پہلے نمرہ میں نزول فرمایا پھر زوال کے وقت وادی عرفہ میں تشریف لائے اور وہ عظیم الشان یادگار خطبہ دیا جس میں اسلام کی ساری اہم اور بنیادی باتیں آپ نے بیان کرنے کے ساتھ ہی کفر وشرک کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکا تھا۔ جاہلیت کی ساری یادگاروں کو مٹا دیا تھا اور لوگوں کو کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھام لینے کی ہدایت فرمائی تھی۔ آپ نے تمام لوگوں سے اقرار کرایا کہ آپ نے انہیں پیغام الٰہی پہنچا دیا جب لوگ اس کا اقرار کر لیتے تو آپ اللہ کو بھی اس کا گواہ ٹھہراتے۔

اس وادی میں آپ نے ظہر وعصر کی نماز جمع کر کے قصر پڑھی، عصر کے لیے اذان نہیں دی گئی اور صرف اقامت پر اکتفا کیا گیا۔

نماز ادا کرنے کے بعد آپ عرفہ کی طرف گئے اور چٹانوں کے پاس غروب آفتاب تک ٹھہر کر دعا و تضرع کرتے رہے، ارشاد ہوا کہ گو میں نے یہاں وقوف کیا ہے لیکن پورا عرفہ موقف ہے۔ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ دن رات میں جب بھی کوئی عرفہ پہنچ گیا، یعنی ۱۰ ذی الحجہ کو رات میں یا طلوع فجر سے پہلے بھی اگر

کوئی عرفہ آجائے تو اس کا حج صحیح ہو جائے گا۔

اسی مقام پر ایک صحابی اپنی اونٹنی سے گر کر ہلاک ہو گئے، تو آپؐ نے فرمایا کہ انہیں ان کے دونوں کپڑوں میں دفن کر دو، نہ ان کو خوشبو لگاؤ اور نہ ان کے چہرے اور سر کو ڈھانکو کیونکہ یہ قیامت کے روز تلبیہ کہتے ہوئے اٹھائے جائیں گے۔

آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ عرفہ کے دن اہل زمین کی طرف اہل آسمان اور ملائکہ کو متوجہ کر کے اظہار فخر و مباہات کرے گا۔ وہ کہے گا میرے ان بندوں کو دیکھو یہ خاک آلود اور پراگندہ حال میرے پاس آئے ہیں، میں تم کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے انہیں بخش دیا۔

عرفہ کے دن کی دعا سب سے بہتر ہے، اس دن نبیؐ اور دوسرے انبیا یہ کہا کرتے تھے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

آفتاب کے غروب سے پہلے ہی آپؐ عرفہ سے مزدلفہ کے لیے روانہ ہوئے راستہ میں لوگوں کو سکون و اطمینان سے چلنے اور ایک دوسرے کو دھکا نہ دینے کی ہدایت فرماتے جاتے تھے۔ خود جب کشادہ راستہ پا جاتے تو تیزی سے چلتے اور جب زیادہ مجمع ہو جاتا اور راستہ تنگ ہوتا تو اطمینان و توقف سے کام لیتے۔

مزدلفہ تشریف لانے کے بعد آپؐ نے مغرب و عشا کی نماز جمع کر کے پڑھی اور عشا کی قصر کی اور یہیں رات گزاری، کمزور لوگوں کو یہ رخصت مرحمت

فرمائی کہ وہ چاند ڈوب جانے کے بعد مزدلفہ سے روانہ ہو سکتے ہیں۔ فجر کی نماز مزدلفہ میں آپؐ نے اول وقت پڑھی اس کے بعد مشعر حرام کے پاس آکر اللہ کو یاد کیا اور آفتاب نکلنے سے پہلے ہی منیٰ کے لیے روانہ ہو گئے، اور جمرۂ عقبہ میں سات بار کنکریاں ماریں۔ اس کے بعد قربانی کر کے سر منڈایا، لوگوں نے دریافت کیا کہ اگر کسی نے رمی سے پہلے قربانی کر دی یا قربانی سے پہلے سر منڈا لیا تو اس کا حج ہوا یا نہیں، رحمت عالمؐ نے فرمایا افعل ولا حرج (کر لو، کوئی حرج نہیں) اسی طرح قربانی کے دن کے جس عمل کی تقدیم و تاخیر کے متعلق آپؐ سے سوال کیا گیا اس کا یہی جواب مرحمت ہوا۔ رمی و حلق کے بعد آپؐ نے بتایا کہ اب عورتوں کے پاس جانے کے علاوہ ہر وہ چیز حلال ہو گئی جو احرام کی وجہ سے ممنوع تھی۔

ان سب کے بعد آپؐ نے طواف افاضہ کیا، جس کے بعد سارے ممنوعات ختم ہو جاتے ہیں اور طواف افاضہ ہر قسم کے حج کرنے والے کے لیے ضروری ہے، خواہ وہ قارن ہو متمتع ہو یا مفرد۔

ایام تشریق یعنی ۱۱ و ۱۲ ذی الحجہ کو حج کرنے والے منیٰ ہی میں قیام کریں گے، دونوں روز جمرات (جمرہ اولیٰ، جمرہ وسطیٰ اور جمرہ عقبہ میں سے ہر ایک کو) سات سات بار کنکریاں ماریں گے۔ اگر کسی نے اس میں عجلت بھی کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا اور جس نے ۱۳ ذی الحجہ کی رات بھی منیٰ میں گزاری اور زوال کے وقت رمی کی تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۔ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ

اور گنتی کے چند دنوں میں اللہ کو یاد کرو سو جو دو ہی دنوں میں

عَلَيْهِ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ لِمَنِ اتَّقٰى ۝ (بقرہ: ۲۰۳)

اٹھ کھڑا ہوا اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو ٹھہرا رہے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں یہ ان کے لیے ہے جو تقویٰ اختیار کریں۔

کمزور اور معذور لوگوں (عورتوں، بچوں اور دوسرے معذورین) کی طرف سے رمی جمار میں نیابت ہو سکتی ہے یعنی اگر ان کے بجائے کوئی اور ان کی طرف سے کنکریاں مار دے تو یہ جائز ہوگا۔

حجاج محترم! اللہ سے ڈریے اور حج و قربانی اور تمام اعمال و اقوال میں اخلاص پیدا کیجیے اور اس سرزمین میں اللہ کو محبوب اور پسندیدہ کاموں کو کر کے اس کا تقرب حاصل کیجیے اور اللہ کو بکثرت یاد کرتے رہیے، میں اپنے اور آپ سب کے لیے خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں حج مبرور نصیب کرے، ہمارے گناہ بخش دے ہماری سعی کو مشکور کر دے بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے، اللہ کی بات سب سے بہتر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سب سے عمدہ ہے، سب سے بدترین چیز بدعتیں ہیں اور ہر بدعت گمراہی ہے، آپ سب پر اجتماعیت لازمی ہے کیونکہ اللہ کی مدد اہل جماعت کے ساتھ ہوتی ہے اور جو جماعت سے الگ ہوا وہ جہنم میں گیا۔

اے اللہ تو اسلام اور مسلمانوں کو اعزاز عطا کر اور شرک و مشرکین کو ذلیل و خوار کر دے، دین کے دشمنوں کو ہلاک کر دے اور اپنے موحد بندوں کی مدد کر، رب العالمین! اس شہر اور مسلمانوں کے ہر شہر کو پُر امن اور اطمینان بخش بنا دے،

اے اللہ تو ہمارے ائمہ اور سربراہوں کی اصلاح فرما دے اور مسلمانوں کے امام کو اپنی محبوب اور پسندیدہ باتیں کرنے کی توفیق دے، اس کے ذریعہ اپنے دین کی مدد کر، اپنے کلمہ کو بلند کر، اللہ سے دعا کیجیے کہ وہ مسلمانوں کے حکام و امرا کو درست کر دے، ان کے دلوں میں الفت پیدا کر دے، ان کے اختلافات ختم کر دے اور انہیں اپنے اور ان کے دشمنوں پر غالب کر دے۔

امام صاحب کا خطبہ ہو گیا تو سب نے ان کی اقتدا میں ظہر اور عصر کی دو دو رکعت نماز ادا کی۔ مسجد نمرہ میں سب کی سمائی کہاں ہوتی، سبقت کرنے والے یہاں بھی بازی لے گئے اور ہم لوگ اس کے اندر جانے کی سعادت سے محروم رہے، ہمارے خیموں سے متصل ہی ایک ایئر کنڈیشنڈ، بہت وسیع اور شاندار ہال تھا، جس کا شامیانہ اور طنابیں خوبصورت اور دلکش تھیں، فرش بھی آرام دہ اور نرم تھا، ہم لوگوں کی نماز اسی میں ہوئی۔

نماز سے فارغ ہونے کے بعد میں اصفرار شمس تک اپنے خیمے ہی میں رہا، بعض لوگوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ جبل رحمت کو گئے، لیکن دھوپ اور گرمی کی شدت کی وجہ سے مجھے اس کی ہمت نہیں ہوئی، البتہ خدا کا شکر ہے کہ اس نے عرفہ میں وقوف کے ایک ایک لمحہ کی اہمیت و عظمت کا احساس دل میں پیدا کر دیا تھا، ایک دقیقہ کے لیے بھی نہ آنکھ جھپکی اور نہ نیند آئی، تلاوت، دعا، اذکار، حمد و مناجات کے یاد آنے والے اشعار پڑھنے میں پورا وقت گزرا، آنسوؤں کا سلسلہ رکتا نہ تھا اور دست دعا بھی برابر دراز رہا، اس احساس کے باوجود کہ میں بڑا گنہگار ہوں، میری دعاؤں کا اثر کیا، تاہم اپنے لیے اور

اپنے تمام متعلقین اور دوست احباب کے لیے دعائیں کیں، آتے وقت بعض اہل تعلق اور عزیزوں نے خاص طور پر اس کی فرمائش کی تھی، ان کے علاوہ جنھوں نے فرمائش نہیں کی تھی ان کے لیے بھی کی، دارالمصنفین اور دنیا کے تمام مسلمانوں کے لیے بھی درگاہ الٰہی میں لطف و رحمت کا طالب ہوا، عالم اسلام اور مسلمانوں کی ذلت و نکبت پر بھی اشک بہائے۔

عرفات میں خواجہ عطار کی مناجات کے یہ اشعار پڑھ کر اپنی تقصیر کا اعتراف اور مولیٰ سے بخشش طلب کی۔

پادشاہا، جرم ما را درگزار ما گنہگاریم و تو آمرزگار

تو نکوکارے و ما بد کردہ ایم جرم بے اندازہ بیحد کردہ ایم

سالہا در بند عصیاں گشتہ ایم آخر از کردہ پشیماں گشتہ ایم

دائما در فسق و عصیاں ماندہ ایم ہم قرینِ نفس و شیطاں ماندہ ایم

روز و شب اندر معاصی بودہ ایم غافل از امر و نواہی بودہ ایم

بے گنہ نگذشت بر ما ساعتے با حضورِ دل نہ کردم طاعتے

بر درآمد بندۂ بگریختہ آبروے خود بعصیاں ریختہ

مغفرت دارد امید از لطفِ تو زانکہ خود فرمودۂ لاتقنطوا

بحر الطاف تو بے پایاں بود ناامید از رحمت شیطاں بود

کیمیا سعدی کی تصنیف خیال کی جاتی تھی لیکن اب محققین کو اس میں کلام ہوگیا ہے بہرحال اس کے یہ اشعار جو بچپن میں زبان زد تھے، یہاں برابر یاد آئے۔

کریما ببخشائے بر حال ما کہ ہستم اسیر کمند ہوا

نداریم غیر از تو فریاد رس توئی عاصیاں را خطا بخش و بس

نگہدار ما را ز راہ خطا خطا درگذار و صوابم نما

اقبال مرحوم کی یہ دعا بھی پڑھتا تھا:

یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے جو قلب کو گرما دے جو روح کو تڑپا دے

پھر وادیٔ فاراں کے ہر ذرے کو چمکا دے پھر شوق تماشا دے، پھر ذوق تقاضا دے

محروم تماشا کو پھر دیدۂ بینا دے دیکھا ہے جو کچھ میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے

بھٹکے ہوئے آہو کو، پھر سوئے حرم لے چل اس شہر کے خوگر کو، پھر وسعت صحرا دے

پیدا دلِ ویراں میں پھر شورشِ محشر کر اس محمل خالی کو، پھر شاہد لیلا دے

اس دور کی ظلمت میں ہر قلب پریشاں کو وہ داغ محبت دے جو چاند کو شرما دے

رفعت میں مقاصد کو ہمدوشِ ثریا کر خودداریٔ ساحل دے آزادیٔ دریا دے

بے لوث محبت ہو، بیباک صداقت ہو سینوں میں اجالا کر، دل صورت مینا دے

احساس عنایت کر آثار مصیبت کا امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

میں بلبلِ نالاں ہوں اک اجڑے گلستاں کا
تاثیر کا سائل ہوں، محتاج کو داتا دے

چراغ حسن حسرت مرحوم کی ایک غزل کے درد و اثر میں بھرے اشعار بھی یاد آئے۔ جس کا ایک شعر ہے۔

یارب غمِ ہجراں میں اتنا تو کیا ہوتا جو ہاتھ جگر پر ہے وہ دستِ دعا ہوتا

جی تو یہی چاہتا تھا کہ عرفہ میں وقوف کی مدت طویل سے طویل تر ہو جاتی ؎

شب وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شب جدائی کا

تاکہ ہم گنہگاروں کو جی بھر کر رونے دھونے اور گریہ و زاری کا موقع ملتا لیکن

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد　　روئے گل سیر ندیدم و بہار آخر شد

اصفرار کے وقت امام صاحب نے باآواز بلند دعا شروع کی، کچھ لوگ خیموں کے باہر کھڑے ہو کر اور کچھ خیموں کے اندر ہی سے آمین کہہ رہے تھے، ہر آنکھ پرنم اور اشکبار اور ہر دل درد میں ڈوبا ہوا تھا، ہچکیوں کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔

امام صاحب دعا ختم کر چکے تو مزدلفہ کے لیے روانگی شروع ہو گئی، سڑکیں اور راستے گاڑیوں اور موٹروں کے علاوہ پیدل چلنے والوں سے بھرے ہوئے تھے، کچھ رات گئے وہاں پہنچے، یہاں بھی کھانے کے لیے پیکیٹ ملے، مغرب و عشا کی نماز جمع کر کے پڑھی گئی، عشا میں قصر ہوا، کنکریاں بھی یہیں چنی گئیں، اس کے بعد سونے کے لیے لیٹ گئے، میں اپنے ساتھ ایک لمبی چوڑی چادر لیتا گیا تھا، اسی کو بچھونا بنایا۔ یہی پروفیسر مسعود صاحب کے بھی کام آئی۔ موسم نہایت اچھا تھا، خوشگوار ہوائیں چل رہی تھیں فوراً نیند آ گئی، صبح سویرے آنکھ کھلی، اول وقت نماز فجر ادا کی گئی، پھر قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبھم اللہ کو یاد کرتے رہے۔ یہاں ہم لوگوں کو مسجد اور ضروریات کی چیزوں کا پتہ نہیں چل سکا، ہمارے ارد گرد جتنے لوگ تھے سب نے مختلف ٹولیوں میں فجر اور مغربین ادا کی، بعد میں معلوم ہوا کہ مسجد اور آسائش و ضروریات کی چیزیں یہاں بھی تھیں لیکن الحمد للہ کسی چیز کی کمی اور تکلیف کا احساس نہیں ہوا، پانی کی فراوانی یہاں بھی تھی، البتہ مجھے اس کا افسوس رہا کہ عرفہ کی طرح یہاں ایک ہی امام کی اقتدا میں

نماز ادا نہیں کر سکے۔

طلوع آفتاب کے بعد منیٰ کے لیے روانہ ہوئے، یہاں پہنچنے کے بعد پہلے جمرہ عقبہ (اولیٰ) کے پاس رمی کے لیے آئے، رمی میں بڑی بھیڑ تھی جس کی وجہ سے زحمت اور پریشانی اٹھانی پڑی اور کافی دھکے بھی کھائے لیکن تھوڑی بہت زحمت تو ناگزیر ہے۔ رمی کے لیے ہم لوگ مولانا عبدالرؤف ملک کی سربراہی میں ایک قافلہ کے ساتھ گئے تھے۔ لیکن سب منتشر ہو گئے۔ چنانچہ جب رمی سے فارغ ہو کر اکیلا اپنی قیام گاہ پر آیا تو بہت خستہ تھا۔ کچھ دیر سستانے کے بعد حلق کرایا اور رات میں ہمارا قافلہ طواف افاضہ کے لیے بیت اللہ پہنچا اور صبح ۴ بجے قیام گاہ پر واپس آیا۔ جس کے بعد ہم لوگ مکمل طور پر حلال ہو گئے۔

۱۱، ۱۲ر کو عصر بعد رمی کی گئی، قربانی کے روز صرف جمرہ عقبہ کے پاس زوال سے قبل رمی کی گئی تھی لیکن دوسرے دنوں میں تینوں جمرات پر رمی کی گئی اور جمرۂ اولیٰ و وسطیٰ پر رمی کے بعد دعا بھی کی گئی لیکن جمرۂ عقبہ کے پاس دعا نہیں کی گئی۔ ہم لوگوں کا قیام منیٰ ہی میں تھا اس لیے ہم ۱۳ر ذی الحجہ کو بھی تینوں جمرات پر رمی کے لیے گئے۔ دوسرے دنوں میں بھی رمی میں معمولی زحمت اٹھانی پڑی لیکن پہلے دن جیسی نہیں۔

منیٰ میں رمی جمرات کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ حضرت ابراہیم ؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیل ؑ کو جب خدا کی راہ میں قربان کر دینے کا ارادہ کیا تو شیطان نے انہیں بہکانا چاہا جس کو انھوں نے کنکریاں مار کر بھگا دیا، بعض روایتوں میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم ؑ نے مینڈھے کو ذبح کرنا چاہا اور وہ بھاگ گیا تو آپ نے

اسے سات دفعہ کنکریاں ماریں اور پھر پکڑ لیا۔ لیکن ترجمان القرآن مولانا حمیدالدین فراہیؒ نے اسے واقعہ فیل کی یادگار بتایا ہے، ان کے نزدیک اصحاب فیل پر وہیں سنگباری ہوئی تھی جہاں رمی کی سنت ادا کی جاتی ہے، انھوں نے اپنی تصنیف سورۂ فیل میں اپنے اس خیال کو بہت مدلل طور پر پیش کیا ہے، مجھے پہلے بھی انہی کا خیال درست معلوم ہوتا تھا، یہاں آکر اور رمی کرکے اس پر مزید شرح صدر ہوگیا، مولانا نے اسی سلسلہ میں حج کو تمام تر مشق جہاد بتاتے ہوئے لکھا ہے:

"چوپایہ کا ذبح کرنا ذبح نفس کی علامت ہے، یہ قربانی ایک فدیہ ہے گویا ایک چوپایہ کے عوض ہم اپنی جان چھڑا لیتے ہیں، بعینہ یہی حقیقت جہاد کی ہے، یعنی نفس کو ذبح کرکے اس کو جہنم کی آگ سے بچا لینا، پھر دیکھو حج کے تمام آداب ومناسک میں بعینہ جہاد کی حقیقت جلوہ گر ہے، یہ روز کا کوچ وقیام اور عجلت کی نمازیں کیا ہیں؟ یہ بالکل فوجی مشق وتمرین ہے، ہر حج کرنے والا پورے یقین کے ساتھ محسوس کرتا ہے کہ یہ مرحلے کسی قائد ہی کی قیادت کے مقتضی ہیں، منازل پر حجاج کی حالت علانیہ فوجی نظم کی ضرورت کا یقین دلاتی ہے، یہ حالات بنی اسرائیل کے خروج مصر کے حالات سے مشابہ ہیں، ان کا کوچ وقیام بالکل فوجی نظم کے ماتحت ہوتا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام سپہ سالار تھے جو ایک طرف جنرل کی طرح فوج کی قیادت کرتے تھے اور دوسری طرف قاضی کی طرح بیٹھ کر فصل مقدمات کرتے تھے۔

مسلمان حج میں اپنے ارادۂ جہاد کی تصحیح کرتا ہے اور ان تمرینی مشقتوں کو برداشت کرکے گویا اس امر کا اعتراف واعلان کرتا ہے کہ ضرورت کے وقت وہ خدا کی

راہ میں اپنی جان قربان کرنے کے لیے بالکل سر بکف آمادہ ہے، اگر رمی کو رمی شیطان کی یادگار مانو تو حج کا یہ تمام فلسفہ بالکل باطل ہو جاتا ہے[۱]"

اب حج کے مراحل اور کوچ وقیام کا سلسلہ ختم ہوگیا، البتہ طواف وداع باقی رہ گیا تھا، پتہ چلا تھا کہ ۱۶ ذی الحجہ تک ہم لوگوں کو مدینہ منورہ جانا ہے اور وہیں سے غالباً ۲۱ ذی الحجہ کو جدہ کے لیے روانگی ہو جائے گی اس لیے ہم لوگ ۱۴ یا ۱۵ ذی الحجہ کو طواف وداع کے لیے گئے اور اس سے بھی فراغت ہوگئی۔

کام تھے عشق میں بہت پر میر — ہم تو فارغ ہوئے شتابی سے

ایام تشریق کے بعد کسی دن رابطہ کے زیر اہتمام ہم لوگ غار حرا اور غار ثور دیکھنے گئے لیکن پہاڑوں پر جانے کی نوبت نہیں آئی۔

۱۱ ذی الحجہ کو رمی جمرات کرکے ہم لوگ آئے اور مغرب کی نماز کے بعد اپنے کمرے میں محو گفتگو تھے کہ دفعتاً ایک صاحب یہ دریافت کرتے ہوئے تشریف لائے کہ کیا ہندوستان سے آنے والے اردو داں حضرات یہاں قیام پذیر ہیں، ہم لوگوں نے عرض کیا جی ہاں، انھوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں نثار رفیع ہوں اصلاً لکھنؤ کا رہنے والا ہوں لیکن اب برسوں سے بسلسلۂ ملازمت جدہ میں مقیم ہوں، سعودی ریڈیو اسٹیشن جدہ کی اردو سروس کا انچارج ہوں، مجھے اردو داں حضرات سے انٹرویو لینا ہے، چنانچہ انھوں نے مجھ سے اور حسین امین اور خورشید کامل قدوائی سے حج کے متعلق ہمارے تاثرات دریافت کیے، ہم لوگوں نے انکے سوالات کے جوابات میں جو کچھ کہا اسے انھوں نے ٹیپ کر لیا جو بعد میں جدہ ریڈیو سے

[۱] تفسیر سورۂ فیل اردو ترجمہ از مولانا امین احسن اصلاحی ص ۱۱۲ و ۱۱۳ اصلاح پریس سرائمیر ۱۹۳۷ء

نشر ہوا جسے ہندوستان کے بعض لوگوں نے بھی سُنا مگر خود ہم لوگ نہیں سن سکے۔

شاہ رفیع صاحب لکھنؤ کی تہذیب و شرافت کا مظہر اور خوش مزاج شخص تھے، وہ دارالمصنفین سے اچھی طرح واقف تھے مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم سے اپنا تعلق بھی بتاتے تھے، انھوں نے یہ بھی بتایا کہ جب شاہ صاحب حج کے لیے تشریف لائے تھے تو ان سے بھی انھوں نے انٹرویو لیا تھا۔

میں ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف سے ملنے کا بہت متمنی تھا، خاص طور پر اس لیے کہ مکہ معظمہ آنے اور حج و زیارت کعبہ سے مشرف ہونے کی سعادت انہی کی بدولت میسر آئی تھی، اس لیے میں ان سے مل کر براہ راست ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا، رابطہ کے دفتر جانے کا ایک خاص محرک بھی یہی تھا لیکن وہاں ملاقات نہیں ہوئی، ایک روز حج کے سلسلہ میں ان کی تقریر ہوئی لیکن میں غالباً طواف کے لیے چلا گیا تھا۔ حج کے ایام میں جب رابطہ کا مہمان خانہ بالکل بھر گیا تھا تو ایک صاحب مجھ سے ملے اور میری خیریت دریافت کرنے لگے، میں نے ان سے پوچھا آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں اور مجھے کیسے پہچانتے ہیں، انھوں نے کہا آپ کا شناختی کارڈ دیکھ کر، میں دارالمصنفین اور آپ کے نام سے تو واقف ہی تھا، جدہ سے حج کے لیے آیا ہوں لیکن رہنے والا اعظم گڈھ میں ماہل کے قریب ایک گاؤں کا ہوں، میں نے علی گڈھ سے انگریزی میں ایم۔اے کیا ہے، نام دریافت کیا تو بتایا السید ضیاء الدین رحمانی' میں نے کہا رحمانی نسبت کی وجہ؟ تو وہ کھلے کہ میں حضرت مولانا فضل رحمان گنج مرادآبادی کے سلسلہ سے منسلک ہوں' باتوں ہی میں نے ان سے ڈاکٹر صاحب سے اپنی ملاقات کی خواہش کا تذکرہ کیا تو انھوں نے کہا انشاء اللہ اس کا نظم کرادوں گا۔

(باقی)

عہد وسطیٰ کے ایک صوفی عنایت شاہ

از جناب ا۔ د۔ شاکر صاحب

ستمبر ۹۲ء کے معارف میں جناب عارف نوشاہی صاحب نے "صوفیائے بیجاپور کے دو اہم فارسی تذکرے" کے عنوان سے دو نایاب مخطوطات کا تعارف کرایا ہے۔ عثمانیہ یونیورسٹی لائبریری حیدرآباد میں عنایت شاہ کا تصنیف کردہ نورنامہ موجود ہے۔ ہوسکتا ہے کہ خوارقات الحیدریہ میں مذکورہ شاہ عنایت ہی عنایت شاہ ہوں گے۔ فہرست سے اس مخطوطہ کی تفصیل درج ہے

نورنامہ

عنایت شاہ

موضوع = عقائد اسلام۔ مثنوی، ۳۴۵ اشعار۔ دکھنی زبان اوراق = ۱۵۔ سطر ۱۳۔

یہ نورنامہ پہلے فارسی میں تھا۔ بعد میں عنایت شاہ نے دکھنی میں لکھا جیسا کہ لکھتے ہیں:

اتھا فارسی نورنامہ ۔۔۔ سو دکھنی کیا شعر میں سربسر

اسی ورق پر مزید اشعار میں اپنا تخلص عنایت و شاہ (و غالباً کتابت میں اضافہ ہے) دادا کا نام محمد پناہ اور مرشد کا نام حسین شاہ بتاتے ہیں مرشد پیر محی الدین (غالباً عبدالقادر جیلانی) کی اولاد میں سے ہیں۔ یہ بھی لکھتے ہیں یہ نظم سنہ ۱۱۱۱ھ میں مکمل ہوئی۔

مرتب کیا نور نامہ تمام — کہ بحق محمد علیہ السلام

کہ ہجرت نبی تھے ہزار ایک صد — بھئے اکیارا تھے سال ہوا ہے بوتد

آغاز:۔ الٰہی کرنہار کرتار توں — سنوارا ہے قدرت سوں سنسار کوں

اختتام:۔ ختم کرکے خاتمہ نت مدام — بحق محمد علیہ السلام

ہزاروں درود اور ہزاراں سلام — بحق محمد علیہ السلام

یہ کتاب ۱۱۱۱ھ میں مرتب ہوئی۔ کتابت بہلول خاں کی۔

ترقیمہ:۔ این نسخہ نور نامہ بتاریخ نوزدہم ماہ صفر المظفر ۱۲۶۵ھ روز یکشنبہ بوقت نماز مغرب کاتب الحروف بہلول خاں برائے پاس خاطر شجاعت خاں مقام چھاونی اورنگ آباد رجمنٹ ہشتم بانصرام رسید۔

یہ کتاب خوارقات الحیدریہ کے ۲۱ سال بعد لکھی گئی ہے، ہوسکتا ہے کہ خوارق حیدریہ کے تالیف کے بعد لکھی گئی ہو۔

اس کے دو اور نسخہ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ میں نمبر ۷۷، ۷۶ پر ہیں[1] اے پی مینسکرپٹ لائبریری حیدرآباد اور ادارۂ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔

عنایت شاہ اور ان کا نور نامہ مزید تحقیق چاہتے ہیں۔ دکھنی ادب کے ماہرین سے امید ہے اس جانب توجہ فرمائیں گے۔

---

1. Descriptive catalogue of Urdu Mss. at Osmania University Library Hyderabad. compiled by Dr. Muhammad Ylarse 1934 V.1. No 75. P.112

آثار علمیہ وادبیہ

مکاتیب مولانا حبیب الرحمن اعظمی

بنام شیخ نذیر حسین صاحب

مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا، لاہور

(۴)

مئوناتھ بھنجن

۲۱ رمضان ۱۴۰۵ھ / ۱۱ جون ۸۵ء

باسمہ سبحانہٗ

مکرمی عالیجناب شیخ نذیر حسین صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

کئی مہینے ہوگئے میں آپ کو کوئی خط نہ لکھ سکا، عورت کی دیت کے بارے میں آپ نے کوئی سوال کیا تھا اس کا بھی جواب دینا مجھے یاد نہیں تعلیمی سال گذشتہ میں میں درحقیقت بہت مصروف رہا، کسی مجبوری کی بنا پر ہدایہ اخیرین، دیوان حماسہ، شرح عقائد اور دیوان متنبی وغیرہ کا درس بھی دیتا رہا، ابن ابی شیبہ کی تحقیق وتصحیح میں بھی برابر مشغول رہا وقفہ وقفہ سے علالت بھی ساتھ دے جایا کرتی تھی ایک سفر کے وقت تین بار ریزرویشن کینسل کرایا ابھی اپریل میں بغداد جارہا تھا تو وارانسی کے ایرپورٹ سے واپس آیا۔

الغرض کچھ ایسے حالات تھے کہ خط لکھنے اور خیر و عافیت دریافت کرنے میں کوتاہی ہوئی، کل مختار الدین احمد صاحب کا بھیجا ہوا ایک منی آرڈر تازیانۂ عبرت ثابت ہوا، اس منی آرڈر کا مصرف معلوم نہ ہو سکا جو بھی مصرف ہو، جزاک اللہ جزاءً موفوراً جامعہ ام القریٰ میں میرا ایک پوتا انور رشید الاعظمی پڑھتا ہے اس کے ہاتھ میں نے عثیمین صاحب کو ایک خط کتابوں کے لیے لکھا تھا انھوں نے فوراً آرڈر کر دیا اور اسی کو دیا کہ اسے مستودع میں دے آؤ مگر چار مہینہ ہو گئے اب تک کوئی کتاب نہیں آئی۔ پاکستان میں علامہ کوثری کی کتابیں کس نے چھاپی ہیں۔

اس سال رمضان شریف میں یہاں موسم بہت سخت رہا اکتوبر کے بعد آج بعد فجر پہلی تھوڑی سی بارش ہوئی جس سے موسم میں ذرا اعتدال پیدا ہوا۔ الحمدللہ روزے ہو رہے ہیں، تراویح بھی بیٹھ کر پڑھ لیتا ہوں، ناغہ بھی ہو جاتا ہے، اس ماہ مبارک میں دعاؤں میں یاد رکھیں تو کرم ہوگا۔ انشاء اللہ میں بھی آپ کو نہ بھولوں گا۔ امید ہے جوابی خط میں علمی اخبار کا افادہ فرمائیں گے۔

حبیب الرحمٰن الاعظمی

(۵) [۱]

مئو۔ اعظم گڈھ یوپی۔ انڈیا

محترم و مکرم جناب شیخ نذیر حسین صاحب زید مجدکم

---

[۱] راقم السطور نے لواطت کی شرعی سزا کے بارے میں استفسار کیا تھا۔ اس کے جواب میں مولانا اعظمی نے یہ خط ارقام فرمایا تھا۔ نذیر حسین

السلام علیکم و رحمۃ اللہ،

بخدا میں بہت شرمندہ ہوں کہ آپ کے خط کا جواب بڑی تاخیر سے دے رہا ہوں، میں اس سال صحیح بخاری اور سنن ترمذی کا درس تبرعاً دے رہا ہوں۔

ہمارے یہاں اس سال بارہ لڑکے دورۂ حدیث میں ہیں ان میں کچھ لڑکے ایسے ہیں جن کو آئندہ سال المعہد العالی للدراسات الاسلامیہ میں داخل کر کے ان کی علمی تربیت کا ارادہ ہے اور تربیت کے بعد انہیں سے مدرسہ میں معیاری تعلیم اور تعلیم کے نظم و نسق کا کام لینے کی نیت ہے، میں ان پر بہت محنت صرف کر رہا ہوں، رمضان سے پہلے دن میں بخاری اور رات میں ترمذی کا درس دیا کرتا تھا اور ماہ مبارک میں بھی عصر سے مغرب تک درس بخاری جاری ہے، اس کے علاوہ مجبوراً کئی طویل سفر اندرون ملک کرنے پڑے، آخری سفر سے ۲۸ر شعبان کو اپنے مستقر پر واپس آیا ہوں، انتظار کی تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔

اس انوکھے اور شرمناک واقعے کے بارے میں جن صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ شریعت اسلامی میں اس کی کوئی سزا نہیں ہے بالکل خلاف واقعہ ہے اس مسئلہ کو معلوم کرنے کے لیے کسی کاوش کی ضرورت نہیں ہے فقہ کی مشہور کتاب الدر المختار جو ہند و پاک کے ہر ہر کتب خانے میں پائی جاتی ہے اس کی شرحوں سے بھی کوئی کتب خانہ خالی نہیں ہوگا، در مختار کے کتاب الحدود میں یہ تصریح ملاحظہ کی جائے۔

زنی بامرءة میتة یعزر (اختیار) الدر المختار علی هامش رد المختار جلد ۳ صفحہ ۱۹۷ طبع امیریہ بولاق اور در المختار ص ۱۵۲ پر الا سیاسة وتعزیرا

کی شرح کے سلسلے میں لکھا ہے السیاسة لاتختص بالزنا بل تجوز فی کل جناية والوای فیھا الی الامام پھر چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں تستعمل اخص من ذالک مما فیہ مزجر وتادیب ولو بالقتل کما قالوا فی اللوطی والسارق والخناق اذا تکرر منھم ذالک حل قتلھم سیاسة پھر لکھا ہے الظاهر ان السیاسة والتعزیر مترادفان،

بہرحال ان تصریحات کے بعد مجھے حیرت ہے کہ یہ کیسے کہہ دیا گیا ہاں اگر یہ کہا جاتا کہ اس صورت میں زانی پر حد جاری نہ ہوگی یعنی اس کو سنگسار نہ کیا جائیگا یا سو کوڑے نہ لگائے جائیں گے بلکہ حاکم اور قاضی اس کی جو سزا تجویز کرے وہ سزا دی جائے گی حتی کہ اگر اپنے اجتہاد شرعی کے رو سے اس کی گردن بھی مروادے تو شرعاً اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

بہت سے نادر مخطوطات کی طباعت واشاعت کا علم اس حقیر کو بھی ہے اور انمیں سے بعض نوادر میں حاصل بھی کر چکا ہوں، مثلاً دلائل النبوة للبیھقی میرے کتب خانہ میں موجود ہے جس کی تلاش میں میں بہت دنوں تک سرگرداں رہا اور آخر میں حلب سے اس کے مکمل نسخے کی فوٹو اسٹیٹ کاپی حاصل کرنے میں مجھے کامیابی حاصل ہوئی۔

میں آپ کی یادفرمائی کا بہت شکرگذار ہوں اور بارگاہِ حق تعالیٰ میں دست بدعا ہوں کہ آپ کو تادیر صحت وعافیت کے ساتھ ہم میں باقی رکھے اور آپ کے قلم کا علمی فیض جاری رہے۔

عبدالرحمٰن کوندو سے مجھے سخت شکایت ہے کہ انھوں نے بہت بے تمیزی

کا خط مجھے لکھا ہے، مجھے مولوی اسعد ٹانڈوی کا آلۂ کار کہنے میں انکو ذرا ہچکچاہٹ نہیں ہوئی خیر ع وکل اناء بالذی فیہ یرشح،

معاف کیجیے گا اوپر کی سطریں ایک ناتجربہ کار طالبعلم کے قلم کی ہیں۔

والسلام حبیب الرحمٰن الاعظمی

(۶)

محترم جناب شیخ نذیر حسین صاحب

السلام علیکم ورحمة اللہ وبرکاتہ

الحمد للہ بخیریت ہوں، ابن ابی شیبہ پر کام جاری ہے، اس کی تین جلدیں طبع ہوگئی ہیں، مگر ہندوستان میں شاید میرے ہی پاس اس کا ایک ایک نسخہ موجود ہے، بیروت سے موسسة الرسالہ نے کشف الاستار عن زوائد البزار کی مکمل ۴ جلدوں میں شایع کردی ہے، مختار الدین صاحب نے آپ کو جو رقم بھیجی تھی وہ دو طالب علموں کو دیدی گئی۔ آپ نے بن باز کے جس فتوی[1] کا ذکر کیا تھا اس کے بارے میں میری رائے پوچھی تھی اس کے جواب میں مندرجۂ ذیل عبارت امام ذہبی کی سیر اعلام النبلاء سے نقل کرا کر بھیج رہا ہوں۔

---

[1] ف۔ دس برس ہوئے کہ شیخ عبدالعزیز بن باز (سعودی عرب) نے اپنی کسی تحریر یا فتوی میں روضہ نبوی کی زیارت اور اس کے پاس سلام وصلوة پڑھنے کو بدعت قرار دیا تھا۔ بعض حلقوں کی طرف سے اس تحریر اور اس کے اردو ترجمہ کی وسیع اشاعت ہوئی، میں نے حقیقت حال کی تحقیق کے لیے مولانا اعظمی سے رجوع کیا۔ اس پر انھوں نے یہ جواب مرحمت فرمایا۔ نذیر حسین

ابن عجلان عن سہیل وسعید مولی المھری، عن حسن بن حسن بن علی انہ رای رجلا وقف علی البیت الذی فیہ قبر النبی صلی اللہ علیہ وسلم یدعو لہ ویصلی علیہ، فقال للرجل: "لا تفعل فان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: لا تتخذوا بیتی عیدا، ولا تجعلوا بیوتکم قبورا، وصلوا علی حیث ما کنتم، فان صلاتکم تبلغنی"۔

ھذا مرسل، وما استدل حسن فی فتواہ بطائل من الدلالۃ، فمن وقف عند الحجرۃ المقدسۃ ذلیلا مسلما، مصلیا علی نبیہ فیا طوبی لہ، فقد احسن الزیارۃ، واجمل فی التذلل والحب، وقد اتی بعبادۃ زائدۃ علی من صلی علیہ فی ارضہ او فی صلاتہ، اذ الزائر لہ اجر الزیارۃ واجر الصلاۃ علیہ، والمصلی علیہ فی سائر البلاد لہ اجر الصلاۃ فقط. فمن صلی علیہ واحدۃ صلی اللہ علیہ عشرا، ولکن من زارہ۔ صلوات اللہ علیہ۔ واساء ادب الزیارۃ، او سجد للقبر او فعل ما لا یشرع، فھذا فعل حسنا وسیئا فیعلم برفق، واللہ غفور رحیم، فو اللہ ما یحصل الانزعاج لمسلم، والصیاح وتقبیل الجدران، وکثرۃ البکاء، الا وھو محب للہ ولرسولہ، فحبہ المعیار والفارق بین اھل الجنۃ واھل النار، فزیارۃ قبرہ من افضل القرب، وشد الرحال الی قبور الانبیاء والاولیاء، لئن سلمنا انہ غیر ماذون فیہ لعموم قولہ صلوات اللہ علیہ: "لا تشدوا الرحال الا الی ثلاثۃ مساجد" فشد الرحال الی نبینا

صلی اللہ علیہ وسلم مستلزم لشد الرحل الی مسجدہ، وذالک مشروع بلا نزاع، اذ لا وصول الی حجرتہ الا بعد الدخول الی مسجدہ، فلیبدا بتحیۃ المسجد، ثم بتحیۃ صاحب المسجد، رزقنا اللہ وایاکم ذالک آمین۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد تابعین میں بھی روضہ مقدسہ کے پاس آکر لوگ درود شریف پڑھا کرتے تھے اور اس پر حضرت علی کے پوتے حسن بن حسن نے نکیر بھی کی تھی مگر شاید ان کی متابعت نہیں کی گئی اس لیے یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوا، چنانچہ امام ذہبی کے عصر میں بہت زور وشور سے ہوتا تھا اور یہ بھی اس عبارت سے ظاہر ہے کہ امام ذہبی نے حسن بن حسن کے استدلال کو بہت کمزور بتایا ہے اور جو ہوتا ہے اس کو مقتضائے محبت رسول قرار دیا ہے۔

اردو انسائیکلوپیڈیا اب تک میرے کتب خانہ کی زینت نہیں بن سکی، خیال تھا کہ پاکستان آؤں گا تو اپنے ساتھ لاؤں گا، مگر وہ سفر ہی ملتوی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ جامعہ ام القری کی کتابیں وہاں سے ہندوستان روانہ ہو چکیں مگر اب تک میرے قبضہ میں نہیں آئیں، معلوم ہوتا ہے دہلی میں کسی کسٹم آفس میں پڑی ہوئی ہیں۔

والسلام

حبیب الرحمٰن الاعظمی

۲۶ ذی قعدہ ۱۴۰۵ھ

وفیات

ڈاکٹر معظم حسین

از پروفیسر مختار الدین احمد

عربی و اسلامیات کے ایک جلیل القدر عالم، ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے سابق صدر اور وہاں کے سابق وائس چانسلر کی وفات کی خبر بنگلہ دیش سے مجھے بہت تاخیر سے ملی، ہندوستان کے اخبارات و رسائل میں تو اس سانحۂ علمیہ کا ذکر بھی نہیں آیا۔

پروفیسر ڈاکٹر سید معظم حسین، متحدہ ہندوستان میں عربی ادب اور علوم اسلامی کے اہم علما میں تھے، وہ مشہور مستشرق پروفیسر مارگولیوتھ (متوفی ۱۹۴۰ء) اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے صدر کے نامور تلامذہ میں تھے، وہ ڈھاکا یونیورسٹی سے امتیاز کے ساتھ عربی میں ایم اے کرنے کے بعد بنگال کی حکومت سے وظیفہ پاکر عربی زبان و ادب کے تنقیدی مطالعے کے لیے انگلستان گئے اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخل ہوکر کئی سال تک پروفیسر مارگولیوتھ کی نگرانی میں علمی تحقیقات میں مصروف رہے۔

مارگولیوتھ، اسلام کے خلاف جس قسم کے تعصبات کے شکار تھے ان سے دنیائے اسلام اچھی طرح واقف ہے، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ عربی ادب کی خدمات میں وہ اپنے معاصرین میں بہت ممتاز رہے ہیں۔ عربی مخطوطات کی ترتیب و تہذیب

سے ان کی گہری دلچسپی تھی۔ ہمیں ان کا احسان بھولنا نہیں چاہیے کہ تراث اسلامی کی تلاش، بازیافت اور ان کی تصحیح و اشاعت کے کارناموں میں انھوں نے مکمل حصہ لیا۔ قدیم مسلم مصنفین کی متعدد تصانیف انھوں نے خود مرتب کرکے یا اپنے احباب اور تلامذہ سے مدون کرا کے انہیں ضایع ہونے سے بچا لیا۔ یاقوت الحموی کی معجم الادبا اور متعدد علمائے عرب کی تصانیف نے ان کی بدولت نئی زندگی پائی۔ ان کے تلامذہ میں ہندوستانی طلبا میں افضل العلماء ڈاکٹر عبدالحق (مدراس)، ڈاکٹر عابد احمد علی (علی گڑھ) ڈاکٹر محمد عبدالحق (حیدرآباد) کے نام یاد آتے ہیں۔ اول الذکر سے انھوں نے دیوان ابن سناء الملک مرتب کرایا، دوسرے سے ابن السکیت کی اصلاح المنطق اور تیسرے سے اسلامی عہد کے ایک شاعر پر کام کرایا۔ ڈاکٹر معظم حسین کے ذمے انھوں نے المفضل الضبی کی المفضلیات اور الاصمعی کی الاصمعیات کا انتخاب کتاب الاختیارین منسوب با بن السکیت کی تصحیح و تحشیہ اور انگریزی ترجمے کا کام سپرد کیا۔ مکمل کتاب تو اب کہیں نہیں ملتی، اس کی جلد دوم کا نسخہ فریتس کرینکو کے پاس تھا جسے ۱۹۱۳ء میں انڈیا آفس کی لائبریری کے لیے حاصل کر لیا گیا تھا، یہ جلد ۱۱۶ قصیدوں پر مشتمل ہے جن میں ۲۳ المفضلیات میں اور ۲۱ الاصمعیات میں موجود ہیں۔ ۷۲ قصیدے ایسے ملے جو ان دونوں کتابوں میں موجود نہ تھے۔ ڈاکٹر معظم حسین نے دو قصیدے خالد بن الصقعب النہدی اور جیہاء الاشجعی کے ایسے دریافت کیے جن کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ کتاب الاختیارین کے گم شدہ حصے کے ہیں، انھوں نے اس طرح ۷۴ قصیدوں کے متن کی تصحیح کی، ان پر حواشی لکھے، اشعار کی تخریج کی اور سارے

قصیدوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا اور ایک مفصل مقدمہ تحریر کیا۔ اکتوبر ۱۹۲۸ء میں انھوں نے اپنا کام مکمل کر کے یونیورسٹی میں داخل کیا جس پر انہیں ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی۔

اپنے تحقیقی کام کے دوران انھوں نے یورپ کے بعض ممالک ترکی اور مصر کا علمی سفر کیا اور اہم اور نادر مخطوطات سے مستفید ہوئے۔ انگلستان سے ڈھاکا واپسی پر وہ شعبۂ عربی میں لکچرر پھر بعد کو پروفیسر اور صدر شعبہ بنے اور آخر میں ترقی کر کے اسی یونیورسٹی کے جس کے کبھی وہ طالب علم رہے تھے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ اس عہدۂ جلیلہ پر وہ متقاعد ہونے تک اپنے فرائض منصبی بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔

تصانیف | ڈاکٹر معظم حسین نے عربی کے دو اہم مخطوطات پہلی مرتبہ مرتب کر کے شایع کیے:

۱۔ نخبة من کتاب الاختیارین للاخفش الاصغر: المفضل الضبی (متوفی ۱۶۴ ۔ ۱۷۰ھ) نے قدیم اور اہم عربی شعرا کے قصائد کا ایک انتخاب تیار کیا، یہ المفضلیات کہلایا۔ عبدالملک بن قریب الاصمعی (متوفی ۲۱۶ھ) کے جمع کیے ہوئے قصائد الاصمعیات کے نام سے مشہور ہوئے، یہ مختارات بہت پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گئے اور انکی متعدد شرحیں لکھی گئیں۔ الاخفش الاصغر (۲۳۵ - ۳۱۵ھ) نے دونوں مجامیع شعری سے کچھ اہم قصائد کا انتخاب مرتب کیا اور ان کی شرح لکھی۔ اس انتخاب نے کتاب الاختیارین کے نام سے شہرت پائی، عجیب اتفاق ہے کہ چوتھی اور پانچویں دو صدیوں تک یہ کتاب مفقود الخبر

رہی، اس عہد کا کوئی مصنف اس کا ذکر نہیں کرتا۔ ابن خیر الاشبیلی پہلا مصنف ہے جو اس کتاب کا ذکر کرتا ہے، لیکن یہ چھٹی صدی ہجری کی بات ہے۔ اس کے بعد یہ کتاب پھر گم ہو جاتی ہے اور تقریباً ۸۰۰ سال تک کسی مصنف کے بیان اس کا ذکر نہیں پایا جاتا اور نہ کسی کتابخانے میں اس کے وجود کی اطلاع ملتی ہے۔ عربی زبان وادب کے نامور عالم اور یورپ کے مشہور مستعرب فریتس کرنکو (۱۸۷۲ - ۱۹۵۳) جو اسلام کی طرف مائل ہونے کے بعد اپنی عربی تحریروں میں اپنے کو سالم الکرنکوی لکھنے لگے اور جن کا دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے گہرا تعلق رہا، پہلے اسکالر ہیں جن سے ۱۳۲۵ھ میں یہیں کتاب الاختیارین کا نام سننے میں آیا، انھوں نے اسی نادر کتاب سے جس کا نسخہ منحصر بفرد ان کے پاس تھا، طفیل بن عوف الغنوی کا، ۰ شعروں پر مشتمل قصیدۂ بائیہ نقل کر کے رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے جرنل میں ۱۹۰۷ء میں شایع کیا۔ جب انھوں نے ۱۹۲۷ء میں لندن سے دیوان طفیل الغنوی شایع کیا تو کتاب الاختیارین ان کے اہم مصادر میں تھی۔

اپریل ۱۹۷۶ء میں میں ایک عالمی کانفرنس میں شرکت کے لیے سودیہ گیا ہوا تھا جہاں جامعۂ حلب میں اس کے جلسے ہو رہے تھے، وہاں ڈاکٹر فخر الدین قباوہ سے ملاقات ہوئی جو اس وقت جامعہ میں مدرس نحو وادب تھے۔ دوران گفتگو انھوں نے علامہ عبدالعزیز المیمنی اور ڈاکٹر معظم حسین کی خیر و عافیت دریافت کی۔ میں نے کہا افسوس ہے کہ یہ دونوں مشاہیر اب ہندوستان میں نہیں ہیں۔ میمن صاحب کراچی میں مقیم ہیں اور معظم حسین ڈھاکا

کا وطن ڈھاکا ہے جو اب بنگلہ دیش میں ہے اور وہ وہیں سکونت پذیر ہیں۔
ڈاکٹر قبادہ نے اطلاع دی کہ ڈاکٹر معظم حسین نے کچھ منتخب قصائد مرتب کیے تھے میں نے کتاب الاختیارین کی اہمیت کے پیش نظر اس کے جزو دوم کا مکمل متن اپنے حواشی و تعلیقات کے ساتھ ابھی حال میں دمشق سے شایع کیا ہے۔ انھیں صنعاء (یمن) میں اس کا ایک اور نسخہ مل گیا ہے، لیکن وہ بھی صرف دوسری جلد کا، پہلی جلد اب بھی مفقود ہے۔ انھوں نے دلچسپ اطلاع دی کہ کتاب الاختیارین ابن السکیت کی تالیف نہیں جیسا کہ کرنیکو اور معظم حسین سمجھتے ہیں؛ بلکہ یہ انتخاب الاخفش الاصغر کا کیا ہوا ہے، انھوں نے اس کے دلائل بھی دیے جو مجھے تشفی بخش معلوم ہوئے، میں نے کہا اصل بات یہ ہے کہ کرنیکو کو کتاب کی صرف دوسری جلد ملی، پہلی جلد کے سرورق پر دیباچے یا ترقیمے میں جامع کتاب کا نام ہو سکتا تھا، لیکن یہ جلد اب بھی مفقود ہے۔ بعض قیاسات کی بنا پر کرنیکو ڈاکٹر معظم حسین نے ابن السکیت کو اس کا جامع ٹھہرایا تھا، الاستاذ فخر الدین قبادہ نے معظم حسین کے شایع کردہ متن، اس کے حواشی اور مقدمے سے استفادے کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے: "افادنی کثیراً فی تصویب بعض العبارات وزیادۃ بعض الابیات"
نخبۃ من کتاب الاختیارین کو ڈاکٹر معظم حسین نے ڈھاکا یونیورسٹی کے خرچ پر مطبع لطیفیہ دہلی سے ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۶ء میں شایع کیا۔ اس کا انتساب انھوں نے اپنے شفیق استاذ پروفیسر مارگولیتھ کے نام کیا ہے۔ الاستاذ فخر الدین قبادہ کا مرتب کردہ ایڈیشن مجمع اللغۃ العربیہ دمشق نے ۱۳۹۴ھ/۱۹۷۴ء میں شایع کیا ہے، جلد اول اب بھی کہیں مل جائے تو اس کا امکان ہے کہ اصل

جامع کتاب کا معاملہ طے پا جائے۔ ویسے فی الحال یہ مان لینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ انتخاب الاخفش الاصغر کا کیا ہوا ہے۔
۲۔ کتاب معرفۃ علوم الحدیث للحاکم النیسابوری: یہ الامام الحاکم ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ الحافظ النیسابوری (۳۲۱ - ۴۰۵ھ) کی مشہور تصنیف ہے۔ ان کی کتاب المستدرک نے بہت شہرت پائی، عرصہ ہوا یہ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے شایع ہو گئی ہے۔ المدخل الی علم الصحیح شیخ محمد راغب الطباخ نے حلب سے ۱۳۵۱ھ میں شایع کر دی ہے، اس وقت معرفۃ علوم الحدیث شایع نہیں ہوئی تھی، ڈاکٹر معظم حسین نے اپنے آکسفورڈ کے کام سے فارغ ہونے کے بعد ۱۹۲۹ء میں اپنے ہاتھ سے برٹش میوزیم کے نسخے کی نقل تیار کی، پھر یورپ، ترکی، شام اور مصر میں انہیں اس کے مزید سات نسخے ملے، جن سے حتی المقدور انھوں نے مقابلۂ متن و تصحیح کلمات میں فائدہ اٹھا کر اس کا متن مرتب کیا اور ڈاکٹر کرنیکو کے مشورے پر دائرۃ المعارف حیدرآباد کو اشاعت کے لیے بھیج دیا۔ حسن اتفاق سے اس کتاب کے مزید تین نسخے کتب خانہ خدابخش، ذخیرۂ حبیب گنج علی گڑھ اور مکتبۂ آصفیہ حیدرآباد میں مل گئے۔ نسخۂ خدابخش کا تو انھوں نے پٹنہ جا کر اپنے تیار کیے ہوئے نسخے سے خود مقابلہ کیا، بقیہ دو نسخوں سے سید محمد ہاشم ندوی مدیر دائرۃ المعارف کی نگرانی میں دائرے کے مصححین نے مقابلہ کیا، یہ کتاب دائرۃ المعارف کے اخراجات پر مطبع دار الکتب المصریہ قاہرہ میں ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء میں چھپی۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مطبع دائرۃ المعارف حیدرآباد سے ۱۳۸۵ھ/۱۹۶۶ء میں شایع ہوا۔

۳-۱ اشعار سراقہ بن مرداس البارقی

سراقہ بن مرداس الازدی البارقی اموی عہد کا ایک قدیم شاعر ہے جو جریر و فرزدق کا معاصر تھا۔ طبقات الشعر للجمحی، المؤتلف والمختلف للآمدی اور العقد الفرید لابن عبد ربہ میں اس کا مختصر سا ذکر ہے۔ کتاب الاغانی جیسی ضخیم کتاب میں اس کے صرف دو مقطوعے درج ہیں اور وہ بھی کثیر اور جریر کے حالات کے ضمن میں، نقائض جریر و فرزدق اور بعض مصادر میں جریر و سراقہ کی ہجاجات کے سلسلے میں بعض اطلاعات ملتی ہیں، طبری اور دوسرے مورخین کے یہاں اگر اس کا نام آیا ہے تو مختار بن عبید الثقفی سے آویزش کے سلسلے میں۔

سراقہ کی زندگی کے حالات پر تاریکی کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ سال ولادت کیا سال وفات تک نہیں معلوم۔ بس اس قدر معلوم ہے کہ وہ سنہ ۶۶ھ میں مختار سے برسرپیکار تھا۔ اس جنگ میں وہ گرفتار ہوا لیکن اپنی مداہنت اور شاعری کی بنا پر وقتی طور پر اس نے نجات حاصل کر لی، ابن کثیر کی البدایۃ والنہایۃ میں سنہ ۸۰ھ کے حوادث و واقعات کے ذیل میں اس کا نام متوفین میں ملتا ہے، امالی الزجاجی سے بھی (مات فی حدود ثمانین من الہجرۃ) اس کے سال وفات کی تعیین میں مدد ملتی ہے۔

سراقہ کا مکمل دیوان (اگر کبھی مرتب ہوا تھا تو وہ) مفقود ہے۔ ابن الندیم کی کتاب الفہرست اور عبد القادر البغدادی کی خزانۃ الادب میں اس کا ذکر نہیں۔ ڈاکٹر معظم حسین کو ویانا (آسٹریا) کے قومی کتب خانے میں اس کے اشعار کا ایک مختصر سا مجموعہ دست یاب ہوا جسے فروری سنہ ۱۹۰۴ء میں غالباً کسی

مستعرب نے برلن کے شاہی کتب خانے کے نسخے سے نقل کیا تھا۔ معلوم ہوا برلن کا نسخہ خود دار الکتب المصریہ قاہرہ کے ایک جدید العہد نسخے (مکتوبہ ۱۲۷۹ھ/) سے منقول ہے۔ ڈاکٹر مرحوم کو حسن اتفاق سے ترکی میں کتب خانہ عاشر آفندی میں ایک اشعار کے ایک مجموعے پر نظر پڑی لیکن یہ بھی ناقص تھا اور درمیانی اوراق غائب تھے۔ اسی زمانے میں قاہرہ کے دوران سفر انہیں دار الکتب میں متعدد شعرائے عرب کے کلام پر مشتمل ایک مجموعہ علامہ الشنقیطی کے ہاتھ کا لکھا ہوا (مکتوبہ ۱۲۹۳ھ) ملا جس میں سراقہ کے کچھ ایسے اشعار بھی درج تھے جو ویانا اور ترکی کے مقدم الذکر نسخوں سے غیر حاضر تھے۔ ڈاکٹر معظم حسین نے ان تینوں مخطوطات (جن میں نسخۂ عاشر آفندی سب سے اہم ہے) کو پیش نظر رکھ کر سراقہ کے قصائد و مقطوعات کو بہت محنت، دیدہ ریزی اور نہایت احتیاط سے مرتب کیا، جن مصادر میں یہ اشعار ملے ان سے ان کا مقابلہ کیا اور متن کی تصحیح میں ان سے مدد لی۔ انھوں نے اسے جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن کے دو شماروں (جولائی، اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء) میں ۳۵ صفحات پر شایع کیا۔ اس میں سراقہ کے اہم قصائد و مقطوعات ہیں۔ بعض قصائد طویل ہیں اور ۷۰، ۱۵ اور ۷۹ ابیات پر مشتمل اور بعض مقطوعات دو دو، تین تین اور چار چار شعروں کے ہیں، موضوع کے لحاظ سے یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس میں دو قطعے عبد الرحمٰن بن مخنف اور ان کے بھائی محمد بن مخنف کے مرثیے میں ہیں، دو مختصر قطعات ابراہیم بن الاشتر کی ہجو میں ہیں اور دو جریر اور ایک فرزدق کی ہجو میں ہے۔ ان کے علاوہ بھی کچھ قصائد و مقطوعات ہیں۔

تقریباً چالیس سال کے بعد ڈاکٹر حسین نصار نے دیوان سراقۃ البارقی، لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر قاہرہ کی طرف سے شایع کیا، ان کے سامنے وہی نسخے تھے جن سے ڈاکٹر معظم حسین استفادہ کر چکے تھے، اس فرق کے ساتھ کہ مرحوم کے پیشِ نظر ترکی کا اصل نسخہ کتبخانہ عاشر آفندی کا تھا اور ڈاکٹر حسین نصار کے سامنے اس سے تیار کی ہوئی ایک نقل نویس کی نقل۔

مرتب نے ابتدا میں ایک تفصیلی پر معلومات مقدمہ لکھا ہے اور متن پر بہت محنت سے تفصیلی حواشی لکھے ہیں، اتنے تفصیلی کہ القینۃ (الامۃ مغنیۃ کانت او غیر مغنیۃ)، القطا (نوع من الطیر)، المبین (الواضح)، الیفاع (المرتفع من الارض)، السمہریۃ (القناۃ الصلبۃ)، ھزبر (الاسد)، اللیث (الاسد)، المدامۃ (الخمر)، الطرف (الغنین)، البیداء (الصحراء)، الفکاھۃ (المزاح)، الھیجاء (الھرب) جیسے مشہور لفظوں کے بھی معانی درج کیے ہیں جن سے عربی مدرسوں کے ابتدائی درجے کے لڑکے بھی واقف ہوں گے۔ انھوں نے حسان بن ثابتؓ، الاعشی، لبیدؓ، مصعب بن الزبیر، ابن الاعرابی، محمد بن حبیب البغدادی اور السکری وغیرہم پر بھی سوانحی نوٹس تحریر فرمائے ہیں جو معروف اشخاص ہیں۔

دیوان مطبوعہ کے آخری صفحے (ص۱۰۶) پر سراقہ کے یہ دو شعر ہیں:

قالوا سراقۃ عنین نقلت لھم   اللہ یعلم انی غیر عنین

فان ظننتم بی الشی الذی زعموا   فقربونی من بنت ابن یاسین

ذیلی حاشیے میں مرتب نے العنین کی تشریح کی ہے: الذی لا یقدر علی

اتیان النساء، ولا یشتھی النساء" لیکن یہ نہیں لکھا کہ یہ بنت ابن یاسین (یا بنت ابن یامین) کون ہے۔ یہ اطلاع ہمارے لیے مفید ہوتی۔

خاتمۂ دیوان پر اصل نسخے میں یہ سطریں درج ہیں: "ھذا آخر ما وجدتہ بخط الحسین بن علی النمری، یقول ھذا آخر ما وجدتہ بخط السکری، یقول ھذا آخر ما وجدتہ فی کتاب ابن حبیب والحمد للہ۔ ووجدت بخط الشیخ ابی احمد بعد ذلک: قابلت بجمیع ما مضیٰ، واعلمت علیہ وکتبت مالم یکتب فیہ فی الحواشی۔"

مرتب دیوان نے ابواحمد پر دس سطروں کا نوٹ لکھا ہے۔ ان کے خیال میں یہ ابواحمد، مصنف کتاب التصحیف، ابواحمد الحسن بن عبداللہ العسکری اللغوی (۲۹۳ - ۳۸۲ھ) ہیں۔ یہ قرین صواب نہیں۔ یہ ابوالعلاء المعری کے دوست ابواحمد عبدالسلام البصری خازن دارالعلم بغداد (متوفی ۴۰۵ھ) ہیں۔ ابوعبداللہ الحسین بن علی النمری مصنف کتاب الملمع کی وفات ۳۸۵ھ میں ہوئی اور ابواحمد العسکری کی تاریخ وفات ۳۸۲ھ ہے۔ یعنی النمری کی وفات سے تین سال پہلے العسکری وفات پا چکے تھے۔ ابواحمد مذکور کو ۳۸۵ھ کے بعد کا ہونا چاہیے۔ یہ ابواحمد عبدالسلام الخازن ہی ہو سکتے ہیں۔

مرتب دیوان نے ڈاکٹر معظم حسین کی علمی کوشش، نسخوں کی تلاش، اس کے قابل قدر مقدمے اور حواشی کا ذکر نہیں کیا۔ اپنے مقدمۂ دیوان کی آخری سطور میں صرف یہ لکھنے پر اکتفا کیا کہ س: م۔ حسین الہندی نے مجلۃ الجمعیۃ الملکیۃ الاسیویہ لندن میں ۱۹۳۶ء کے دو شماروں میں اسے نشر کیا ہے اور یہ کہ

ہمارے اڈیشن سے پہلے دیوان سراقہ مستقل کتابی صورت میں طبع نہیں ہوا۔ یہ مناسب اور علمی طریقہ نہیں۔ انھوں نے یہ نہیں لکھا کہ انھوں نے اس سے فائدہ اٹھایا یا نہیں۔ دیوان کی ترتیب جدید کے وقت ڈاکٹر مرحوم کا کام ان کے پیش نظر ضرور رہا ہوگا اور اس سے انھوں نے استفادہ بھی کیا ہوگا۔ لیکن پوری کتاب میں مرحوم کا کہیں ذکر نہیں۔ اگر طبع معظم حسین انھوں نے پیش نظر نہیں رکھا تو بھی یہ بات قابل اعتراض ہے۔ کسی قلمی نسخے کی ترتیب واشاعت کے وقت حتی الامکان سارے مخطوطات اور اگر کتاب چھپ گئی ہو تو مطبوعہ اڈیشن بھی سامنے رکھنا شرق وغرب کے علماء کا دستور رہا ہے۔ ڈاکٹر معظم حسین کا مرتب کردہ دیوان کا متن دنیا کے ایک مشہور رسالے میں شایع ہوا تھا جس سے استفادہ مشکل نہ تھا۔

یورپ، ترکی اور شرق اوسط کے قیام وسفر کے دوران ڈاکٹر معظم حسین کو عربی کے اہم مخطوطات کے مطالعے کے بڑے مواقع ملے۔ کچھ کے عکسی نقول وہ ساتھ لائے ہوں تو عجب نہیں۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ منتہی الطلب من اشعار العرب لابن میمون البغدادی سے ان کی گہری دلچسپی تھی۔ انھوں نے اس پر انگریزی میں ایک مضمون بھی لکھا تھا اور اس کتاب سے ایک قصیدہ انھوں نے شایع بھی کیا تھا۔ اس بات کا خاصا امکان ہے کہ انھوں نے مکمل کتاب نہ سہی اس کا ایک حصہ مرتب کیا ہو لیکن شایع نہ کر سکے ہوں۔

ڈاکٹر معظم حسین کی ایک تحریر مورخہ اکتوبر ۱۹۲۵ء سے جو آکسفورڈ میں لکھی گئی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ الاصمعیات کا مکمل اڈیشن مرتب کر کے شایع کرنا چاہتے تھے۔ اس اڈیشن کی تکمیل اور اس کی اشاعت کے بارے میں پھر کوئی اطلاع

نہیں ملی۔ الاصمعیات کا وہ اڈیشن جو مستعرب آلوردٹ نے برلن سے ۱۹۰۲ء میں شایع کیا تھا غیر مکمل تھا۔ ڈاکٹر معظم حسین کے سامنے اس کا وہ قلمی نسخہ تھا جو کتب خانہ کوپرولو، ترکی میں محفوظ ہے۔

ڈاکٹر معظم حسین کے اعزہ، تلامذہ اور ڈھاکا یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے اساتذہ اگر ان کے ذخیرۂ کاغذات میں منتہی الطلب اور الاصمعیات کے سلسلے کے مسودات تلاش کر سکیں تو یہ ایک مفید علمی خدمت ہوگی، ہر چند کہ اب الاصمعیات کا بہت اچھا اڈیشن قاہرہ سے نکل آیا ہے اور منتہی الطلب کے کچھ اجزا اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔

مقالات:-

ڈاکٹر معظم حسین نے زیادہ تر مقالات انگریزی میں لکھے ہیں۔ ان کا عربی میں ایک مقالہ جو دمشق میں چھپا تھا میری نگاہ سے گزرا ہے، ممکن ہے انھوں نے اور بھی لکھے ہوں۔

۱۔ الخیل والابل فی الشعر الجاهلی — مجلة المجمع العلمي العربي دمشق (جلد ۲۲ ص ۱۲۱-۱۲۹) میں شایع ہوا۔

۲۔ ایک غیر معروف قدیم عربی قصیدہ — روداد اجلاس ششم آل انڈیا اورینٹل کانفرنس میں چھپا، ۱۹۳۰ء

۳۔ بنگال میں اسلامی تعلیمات — مطبوعہ "اسلامک کلچر حیدرآباد" ۱۹۳۴ء

۴۔ قدیم عربی شاعری کا ایک غیر معروف مجموعہ — روداد اجلاس ہشتم آل انڈیا اورینٹل کانفرنس، ۱۹۳۵ء

۵۔ اشعار سراقۃ بن مرداس البارقی — جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسایٹی لندن، ۱۹۳۶ء

۶۔ تلبیات الجاھلیۃ — مطبوعہ روداد اجلاس نہم آل انڈیا اورنٹیل کانفرنس، ۱۹۳۷ء

۷۔ عہد سلطنت دہلی (۱۲۰۶۔۱۳۷۰ء) میں اہل الذمہ — مطبوعہ اسٹڈیز ان اسلام شمارہ ۴، ۱۹۶۷ء

۸۔ اسلام میں تعزیرات پر توبہ کا اثر — مطبوعہ اسلامک اسٹڈیز شمارہ ۸، ۱۹۶۹ء

میرا خیال ہے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جرنل اور بنگلہ دیش کے علمی انگریزی رسالوں میں بھی انکے مضامین ضرور شایع ہوئے ہوں گے، لیکن وہ میری نظر سے نہیں گزرے اس کا بھی امکان ہے کہ عربی ادب اور اسلامیات پر ان کے مضامین بنگلہ زبان کے رسائل میں اشاعت پذیر ہوئے ہوں۔

ڈاکٹر معظم حسین اور الاستاذ عبدالعزیز المیمنی میں گہرے علمی روابط قائم تھے، قدیم عربی شاعری کا مطالعہ ان دونوں کا مشترک موضوع تھا۔ مرحوم کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ متن کی تصحیح اور قدیم مصنفین و شعرا کے حالات کے متعلق جب بھی انہیں مشکلات پیش آئیں تو انھوں نے بغیر کسی تکلف کے الاستاذ المیمنی کی طرف رجوع کیا، الاستاذ نے ایک تحریر مجھے لکھکر دی تھی جس میں ان سے مستفید ہونے والوں میں نام تھے، یورپ، شرق اوسط اور ہندوستان کے بعض جلیل القدر علماء کے ساتھ ڈاکٹر معظم حسین مرحوم کا بھی نام ثبت تھا، ڈاکٹر معظم حسین بھی نئی اور اہم مخطوطات کے بارے میں الاستاذ کو اطلاع دیتے رہتے تھے منتھی الطلب لابن میمون کی دریافت ڈاکٹر معظم حسین کی کوششوں کا نتیجہ ہے انھوں نے دریافت کرتے ہی الاستاذ کو اسکی اطلاع دی اور انکی طلب پر شعرا اور ہزار قصیدوں کی مکمل فہرست

انہیں بھیج دی۔ یہ فہرست شعرا و قصائد اب میرے ذخیرۂ مخطوطات میں ہے۔

افسوس ہے کہ ایسے جلیل القدر عالم سے مجھے شرف ملاقات حاصل نہ ہو سکا، اگرچہ تعلقات قائم ہوئے اور ہمیشہ استوار رہے۔ ایک موقع ایسا آیا تھا کہ میں ڈھاکا جاکر وہیں کا اور انہی کا ہو جاتا۔ لیکن قضا و قدر کے فیصلے کچھ اور تھے۔ سنہ ۴۹ء کے اوائل میں ڈاکٹر معظم حسین نے الاستاذ کو لکھا کہ یہاں برنداین کالج اور ڈھاکا یونیورسٹی میں عربی کے ایک لکچرر کی ضرورت ہے، اپنے شاگردوں میں کسی ممتاز اور مستعد شخص کا نام بھیج دیجئے کہ تقرر کے لیے مناسب کارروائی کی جائے، الاستاذ نے میرا نام تجویز کیا اور ڈھاکا میں اسے منظور بھی کر لیا گیا، لیکن اس زمانے میں تقسیم ہند کی وجہ سے حالات غیر مستقیم تھے، پھر میں الاستاذ کی نگرانی میں ان کے خاص موضوع پہ ریسرچ کرنی چاہتا تھا، اس لیے ڈھاکا کی لکچررشپ پر علی گڑھ کی طالب علمی کو ترجیح دی۔ میں علی گڑھ ہی میں رہا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔

اگست سنہ ۱۹۹۱ء میں ڈھاکا یونیورسٹی نے مجھے یونیورسٹی کے ایک کام سے مدعو کیا تھا، وہاں عربی، اسلامیات، فارسی اور اردو کے سارے اصحاب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ڈاکٹر معظم حسین سے ملنے کی خواہش کا ذکر کیا، ان کے شاگرد اور رفیق شعبہ پروفیسر سراج الحق سابق صدر شعبۂ عربی و اسلامیات نے کہا ان سے اسوقت ملنا مناسب نہ ہوگا وہ سخت علیل ہیں، پھر کبھی آیئے تو ملاقات کراؤں گا، اب اطلاع ملی کہ وہ طویل علالت کے بعد ڈھاکا میں رحلت کر گئے۔ رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ واسکنہ فسیح جناتہ جزاء ما بذل من جھد جاھد فی خدمۃ لسان تنزیلہ العزیز۔

ادبیات

غزل

از

جناب وارث ریاضی صاحب

مری بے زبانی، زباں ہو نہ جائے
نہاں ہے جو دل میں عیاں ہو نہ جائے

وہ مجھ پر کہیں مہرباں ہو نہ جائے
متاعِ سکوں رائیگاں ہو نہ جائے

ترے روٹھ جانے سے اے جانِ عالم!
مکینِ جہاں بے مکاں ہو نہ جائے

ستاروں سے آگے قدم رکھنے والو!
زمینِ ستم، آسماں ہو نہ جائے

کہیں میری روداد دردِ محبت
مری جاں! تری داستاں ہو نہ جائے

جو وجہ نمودِ کرم ہے الٰہی!
وہ ذوقِ گنہ رائیگاں ہو نہ جائے

مجھے شہر میں بے اماں کرنے والا
وہی بے اماں ناگہاں ہو نہ جائے

مری جرأتِ عرضِ حسنِ تمنا
کہیں انکے دل پر گراں ہو نہ جائے

عداوت، مظالم، تصادم سے وارثؔ
جہنم یہ جنت نشاں ہو نہ جائے

مطبوعات جدیدہ

واقعہ کربلا اور اس کا پس منظر از جناب مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ، کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۵۶، قیمت ۷۰ روپیے

پتہ : الفرقان بکڈپو ۳۱ - نیا گاؤں مغربی نظیر آباد، لکھنؤ،

اسلامی تاریخ کے نہایت دلدوز اور المناک سانحہ کربلا کے اسباب اور اس کے اصل حقایق کی تلاش اور دریافت محقق مصنفین اور علمائے اسلام کا موضوع بحث رہ چکا ہے، حافظ ابن تیمیہؒ وغیرہ کے خیالات سے اہل علم کو واقفیت ہو گی لیکن تشیع کے گرد و غبار کو صاف کرنا آسان نہیں، زیر نظر کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد سے کربلا تک کے واقعات اور تاریخی روایات اور خاص طور پر یزید کی ولیعہدی اور یوم عاشورہ کی تفصیلات کا تجزیہ کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ " اس حادثہ فاجعہ کو بجز تقدیر الٰہی اور مشیت ایزدی کے اور کیا کہا جائے" مولف کے نزدیک گو یزید کی ولیعہدی مناسب نہیں تھی تاہم حضرت حسینؓ کے خون ناحق کی اصل ذمہ داری انہی پر عائد نہیں ہوتی، وہ حضرت حسینؓ کے اقدام کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس کا سبب یزید کا فسق و فجور نہیں تھا لیکن حضرت حسینؓ کے نقطہ نظر اور ان کے اقدام کے اسباب و اغراض کی وضاحت مزید تفصیل کی متقاضی تھی اس لیے کہ جمہور کی رائے میں حضرت حسینؓ کا اقدام حسبۃ للہ اور خلافت علی منہاج النبوۃ کے پاک و مقدس جذبہ پر مبنی تھا، یہ بحث بڑی نازک ہے۔ گو فاضل مصنف اس خطرناک مرحلے

سے ایک حد تک سلامتی کے ساتھ گزرنے میں کامیاب ہوئے ہیں، تاہم اس قسم کے فقرے اور جملے نہیں لکھنے چاہیے تھے کہ "وہ (عبدالرحمن بن ابی بکرہ) بالکل ہی شمشیر بے نیام تھے" "وہ (متقدمین مورخین) معاویہؓ دشمنی کا اندھاپن' معاویہؓ دشمنی کی اندھی دبا کے زہر" سے بچ نہیں پائے، انھوں نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ حدیث کی روایات کے برخلاف ان تاریخی روایات کی جمع و تدوین میں احتیاط کیوں نہیں برتی گئی، اس سلسلہ میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم نے تاریخ اسلام میں بڑا متوازن تبصرہ کیا ہے کہ "یہ تاریخ نویسی کا بالکل ابتدائی دور تھا، واقعات کی تحقیق و تنقید مورخ کا فرض سمجھا نہ جاتا تھا بلکہ وہ اس کو تاریخی دیانت سمجھتے تھے کہ انہیں جو معلومات حاصل ہوں انہیں بے کم و کاست اپنی رائے ظاہر کیے بغیر تاریخوں میں داخل کر لیں، اس لیے جن صحیح واقعات کے ساتھ بہت سی کمزور روایات اور غلط واقعات بھی تاریخوں میں داخل ہو گئے انھی میں امیر معاویہؓ بلکہ بنی امیہ کے مثالب بھی ہیں، بنو عباس کے زمانہ میں سیاسی مصالح کی بنا پر سینکڑوں افسانے تراشے گئے، ایسے حالات میں مسلمان مورخین کی ہمت پھر بھی لائق ستائش ہے کہ انھوں نے جرات و صداقت سے کام لے کر ان واقعات کے ساتھ بنی امیہ کے محاسن بھی قلمبند کر دیے" واقعہ کربلا اور اس کے پس منظر کے فاضل مصنف کو اس کی کوشش ضرور کرنی چاہیے تھی کہ ان کی کتاب پڑھ کر لوگ یہ نہ سمجھیں کہ حضرت علیؓ اور حضرت حسینؓ خطا کار تھے یا ان کا موقف حق پر مبنی نہیں تھا، راہ اعتدال شیعیت اور ناصبیت کے درمیان میں ہے۔

نویں صدی ہجری کے حوالہ سے مصری مورخین ایک تنقیدی مطالعہ

از جناب غلام یحییٰ انجم متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۲۴، قیمت لائبریری ایڈیشن ۲۵ روپیے عام ایڈیشن ۱۵ روپیے پتہ: المجمع الاسلامی مبارکپور ضلع اعظم گڈھ۔

یہ لائق مرتب کا اہم فل کا مقالہ ہے اس میں انھوں نے نویں صدی ہجری کے پانچ ممتاز مصری مورخین بدرالدین العینی، ابن عرب شاہ، ابن تغری بردی، برہان الدین بقاعی اور شمس الدین سخاوی کے حالات و تصنیفات کا جائزہ لیا ہے گو حواشی اور تعلیقات سے ان کی محنت و کاوش نمایاں ہے لیکن ابھی مصنف میں پختگی کی کمی ہے اس لیے عبارتوں اور جملوں میں ناہمواری ہے، جیسے "علامہ عینی کج خلقی، دنائت جیسے برے اوصاف سے متصف نہ تھے' طبیعت میں انکساری، ذہن و دماغ میں سنجیدگی کافی حد تک پائی جاتی تھی" "ان کی انکساری اور تواضع کی بھی تشہیر ہوئی" مصنف کی تحریر میں جانبداری بھی آگئی ہے چنانچہ ابن تغری بردی اور سخاوی کے موازنہ میں ان کے خیالات محل نظر ہیں، بردی کے ذکر میں ایک جگہ امام سخاوی کے متعلق شبہ ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ممکن ہے سخاوی نے ان کے اسقام عوام اور اہل علم کے سامنے پیش کر کے اپنے کو افضل ترین ثابت کرنے کی کوشش کی ہو" لیکن بردی نے اپنے استاد پر زبردست تنقید کی تو مولف نے اسے لائق ستایش سمجھا ہے، قلم کی بے احتیاطی ملاحظہ ہو "ابن تغری بردی کے اساتذہ گرچہ اپنی جگہ علم و فن کے آفتاب تھے لیکن اپنی صلاحیت کا لوہا منوانے کے لیے مختلف چالیں چلتے تھے ص۱۱۳" "بردی کے آخر زمانہ میں حافظ سخاوی نے سر اٹھایا" ص۱۱۳، عربی عبارتوں کا ترجمہ بھی کہیں کہیں درست نہیں ہے ص۱۱۴ کی ایک عبارت کے ترجمہ میں "وہ (بردی) خود کو فرانسیسی کھیلوں کا ماہر بتاتے تھے" خدا جانے کس کا ترجمہ ہے، ایسا ہی نمونہ یہ بھی ہے "فیھا کثیر من الخلط والوھم" ان کی تصانیف میں چاپلوسی اور اوہام کا زیادہ دخل ہے" ترجمۃ مظلمۃ کا ترجمہ

مظلوم سوانح کیا ہے، وانہ لا شبہ الخوارج یعنی وہ خوارج سے زیادہ مشابہ تھے کا ترجمہ خوارج سے مشابہت پیدا کی بھی صحیح نہیں، ص۱۳۹ کی ایک عبارت کا ترجمہ حد درجہ غلط اور ناقص ہے۔

گھر اور مسائل تربیت از جناب مولانا عبدالوحید قاسمی ایم اے، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت، طباعت بہتر، صفحات ۱۸۳، قیمت ۱۵ روپیے، ناشر، بزم رشید پارہ کمال، جونپور، یوپی۔

اسلام کے عائلی نظام خصوصاً شادی بیاہ کے متعلق عربی میں ایک عمدہ کتاب "تربیۃ النشوفی ظل الاسلام" کے نام سے شایع ہوئی، زیر نظر کتاب میں اسی کتاب کے بعض مباحث کی مدد سے لائق مصنف نے نکاح و زواج اور دوسرے عائلی مسائل کے متعلق اپنے مطالعہ اور تجربہ کی روشنی میں اسلامی تعلیمات و ہدایات کو خوبی سے جمع کر دیا ہے ان کا انداز تحریر موثر اور دلنشین ہے، آیات و احادیث بڑے موقع سے درج کی گئی ہیں، بہتر ہوتا کہ انکے حوالے اور وضاحت سے دیے گئے ہوتے، بعض الفاظ مثلاً شریکہ حیات، قداست، مصاریف شاید عربیت کے زیر اثر آگئے ہیں۔

۱- اسلامی بیداری کی نئی لہر ۲- مسجد اقصیٰ کی پکار از جناب مولوی محمد الیاس بھٹکلی ندوی، قیمت بالترتیب ۶ روپیے اور ۳ روپئے پتہ: مکتبۃ الحسنات ۴۲۲۱، کوچہ چیلان دریا گنج نئی دہلی۔

پہلے رسالہ میں نامساعد اور حوصلہ شکن حالات کے باوجود اسلام کے پیغام کی روز افزوں اشاعت اور اسکی جہانگیری کے مثبت و روشن پہلو کا جائزہ لیا گیا ہے دوسرے رسالہ میں مسجد اقصیٰ کے ماضی و حال کے علاوہ مستقبل میں اسکی بازیابی کے امکانات پر روشنی ڈالی گئی ہے، دونوں رسالوں سے لائق مصنف کا علم، دینی جذبہ اور مثبت انداز فکر بھی نمایاں ہے۔

(ع-ص)